آخری موسم
محی الدین نواب

آخر وہ ہو گیا جو کبھی نہ ہوا تھا۔

وہ گھر سے بھاگ گئی۔ بھاگنے کو جوان لڑکیاں اور پکی ہوئی عمر کی عورتیں بھاگتی ہیں۔ پانچ دس بچوں کی ماؤں کے بھاگنے کی بھی خبریں پڑھی جاتی ہیں۔ لیکن آج تک کسی نے یہ پڑھا نہ سنا کہ ساٹھ برس کی عمر میں کوئی عورت بھرا گھر چھوڑ کر گئی ہو۔ گھر چھوڑ کر جانا اور بات ہے بھاگنا اور بات ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا مگر ہو گیا۔ رُبابہ خاتون عرف رُبا ساٹھ برس کی عمر میں سٹھیا کر گھر سے بھاگ گئی۔

گھر کے پُرسکون ماحول میں ہلچل مچ گئی۔ ظلِ سبحانی اپنی بیگم کی اس جرأت پر حیران اور پریشان تھا۔ چھڑی ٹیک ٹیک کر اوپری برآمدے میں ٹہلتے ہوئے غصے کا اظہار کر رہا تھا۔ اس چھڑی کا دستہ ہاتھی دانت کا تھا۔ وہ اپنے نقلی دانت پیس رہا تھا بس، جی چاہتا تھا کہ ابھی رُبا سامنے آئے اور وہ چھڑی سے پٹائی شروع کر دے۔

نیچے ڈرائنگ روم میں گھر کے افراد کچھ بیٹھے ہوئے' کچھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ بھاگنے والی پر تبصرہ کر رہے تھے اور سر اٹھا کر اوپری برآمدے میں بھاگنے والی کے مجازی خدا کو دیکھ رہے تھے۔ ظلِ سبحانی نے زینے کے اوپری حصے پر پہنچ کر بے بسی سے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں کیا کروں؟ میرے لئے ڈوب مرنے کی بات ہے۔ میری بیوی بھاگ گئی ہے۔ میں کسی کو شرم سے منہ نہیں دکھا سکوں گا۔"

بڑے بیٹے جمال نے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ابا جان' آپ کے لئے یہ شرم کی بات ہے اور ہمارے لئے توہین کی بات ہے کہ ہماری ماں بھاگ گئی ہے۔ یہ کتنی بڑی گالی ہے۔"

ببلی نے چیونگم چباتے ہوئے جمال سبحانی سے کہا۔ "پاپا! دادا جان کے لئے شرم اور آپ کے لئے گالی ہے مگر ہمارے لئے ہوربل جوک ہے۔ بھیانک مذاق ہے۔ سوسائٹی میں مذاق اُڑایا جائے گا میرے فرینڈز کہیں گے کہ دادی جان کو بھاگنے کی

پریکٹس تھی تو اولمپک کے میدان میں بھاگنا تھا۔ کوئی تمغہ ہاتھ آجاتا۔"

بانو بے مثال ایک صوفے پر بیٹھی ٹیلی فون پر عزیزوں' رشتے داروں سے باری باری رابطہ قائم کررہی تھی۔ اس کا خیال تھا اس کی امی ناراض ہو کر کسی رشتے دار کے ہاں رہنے گئی ہوں گی۔ وہ کسی نہ کسی کے ہاں مل جائیں گی۔ بلی کی باتیں سن کر بانو بے مثال نے کریڈل پر ہاتھ رکھا.......... ٹیلیفون کا رابطہ ملتوی کیا۔ پھر بزرگانہ انداز میں کہا۔ "بلی! تم بہت اوور ہو جاتی ہو۔ اپنے دوستوں سے پہلے خود اپنی دادی جان کا مذاق اڑا رہی ہو۔"

بلی جینز اور جیکٹ پہنے کھڑی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کہا۔ "دادی جان خود اپنا مذاق اڑا رہی ہیں۔ ویسے بانو پھوپھی آپ اتنی حسین اور پرکشش ہیں کہ بانو بے مثال کا نام آپ پر سوٹ کرتا ہے مگر اس گھر کا الٹا دستور ہے۔ اگر سچی بات کا برا نہ مانیں تو کہوں۔ آپ جوان ہیں' بھاگنا آپ کو چاہئے مگر.........."

بانو چیخ کر صوفے سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "یو شٹ اپ' بھابی جان! آپ نے اور بھائی جان نے بلی کو منہ زور اور بے لگام بنادیا ہے۔ اسے کم از کم بزرگوں سے باتیں کرنے کی تمیز تو سکھادیں۔"

بلی کی ماں نے کہا۔ "اے بانو! تم اپنی ماں کا غصہ میری بیٹی پر کیوں اتار رہی ہو اور تم کہاں کی بزرگ آگئیں۔ نہ شادی نہ بیاہ پچیس برس ہوگئے۔ جانے کس شہزادے کے انتظار میں کنواری بیٹھی ہو۔"

بانو کا بڑا بھائی جمال سبحانی تھا۔ اس سے چھوٹے بھائی راحت سبحانی نے کہا۔ "بانو! میں سمجھتا ہوں۔ امی تم سے پریشان ہو کر گئی ہیں۔ جو بھی رشتہ آتا ہے' تعلیم کا بہانہ کرکے ٹال دیتی ہو۔ تم آج شادی کرلو تو وہ آج لوٹ کر آجائیں گی۔"

بانو نے کہا۔ "بھائی میاں! ماں اپنی بیٹی کو سہاگن بنائے بغیر دنیا سے نہیں جانا چاہتی۔ پھر گھر سے کیسے جاسکتی ہے۔ امی کو آپ دونوں بھائیوں کی فضول خرچی نے پریشان کیا تھا۔ آپ لوگ آئے دن بڑی بڑی رقمیں مانگتے رہتے تھے۔ آخر وہ کہاں تک آپ کی مانگیں پوری کریں۔"

بڑے بھائی جمال سبحانی نے چونک کر کہا۔ "ارے ہاں' رقم کی بات آئی تو یاد آیا۔ ابا جان! کیا امی یہاں سے کچھ رقم لے کر گئی ہیں؟"



ظلِ سبحانی تھکے ہوئے انداز میں اوپری حصے پر بیٹھ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھڑی تھی اور دوسرے ہاتھ میں وہ خط تھا جیسے زبا اس کے نام چھوڑ گئی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "کل تمہاری ماں میرا ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔ ظلے.........."

بلی نے کہا۔ "دادا جان' رومانٹک ہو رہے ہیں۔"

ظلِ سبحانی نے گھور کر پوتی کو دیکھا۔ جمال سبحانی نے کہا۔

"بلی کو چھوڑیں۔ یہ بتائیں۔ امی جان نے کیا کہا؟"

"تمہاری امی نے کہا۔ "ایک لاکھ روپے اپنے اکاؤنٹ سے نکال کر لے آئیے۔" میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "میرے روپوں کی بھلا تمہیں کیا ضرورت ہے۔ میرے اندازے کے مطابق تمہارے اکاؤنٹ میں اسی پچاسی لاکھ روپے تو ضرور ہوں گے۔ پھر جانتے ہو تمہاری ماں نے کیا کہا؟"

دونوں بیٹے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ بہوئیں بھی ادھر دیکھنے لگیں۔ پھر ایک نے پوچھا۔ "کیا کہا؟"

ظلِ سبحانی نے کہا۔ "پہلے تو تمہاری امی مسکرائیں۔ پھر میرے ہاتھ کو جھٹک کر کہا۔ "جائیے میں آپ سے نہیں بولتی۔ ایک لاکھ روپے کے لئے میرے بینک بیلنس کا حساب کررہے ہیں۔ میں نے کہا۔ نیک بخت! کچھ معلوم تو ہو آخر ایک لاکھ روپے کیا کروگی؟ آہ' پھر تمہاری امی بڑے ہی پُراسرار انداز میں مسکرائیں۔ اس کے بعد کہا۔ میں آپ کو ایک سرپرائز دینا چاہتی ہوں۔"

اس نے خط کو ذرا بلند کرتے ہوئے کہا۔ "زبا نے یہ سرپرائز دیا ہے۔ اس میں لکھا ہے۔"

وہ خط کھول کر پڑھنے لگا۔ اس میں زبا نے لکھا تھا۔

"ظلے! میں جارہی ہوں' میں نے اپنی زندگی کا پہلا موسم بابل کے آنگن میں گزارا۔ میں وہاں اپنی من مانی کرتی تھی۔ جھولے جھولتی تھی۔ اپنی نیند سوتی تھی۔ اپنی مرضی سے کھاتی تھی۔ اپنی پسند کا پہنتی تھی۔ سوچتی تھی۔ میری من مانی کا یہ موسم سدا رہے گا۔ آہ' یہ میری خوش فہمی تھی۔ جو ختم ہوگئی۔

دوسرے موسم میں بہار آئی۔ پتہ چلا کہ بابل کے آنگن میں جو درخت ہے میں

اس درخت کا پھول ہوں۔ کھل رہی ہوں پھل ہوں' پک رہی ہوں' خوشبو ہوں۔ مجھے پر لگ گئے ہیں۔ انگنا کی دیواری کے باہر میں آگے آگے جا رہی ہوں تم پیچھے پیچھے آ رہے ہو۔ تم میری خوشامدیں کر رہے ہو۔ میں تمہیں تڑپا رہی ہوں تم شاہ بھی تھے گدا بھی تھے۔ میرے حسن کی خیرات مانگتے تھے اور کبھی مجھ سے جبراً مجھے چھین لیا کرتے تھے۔ ہائے' وہ کیسے دن تھے۔

زندگی کا ہر آخری لمحہ ہچکی لے کر گزر جاتا ہے مگر حسرتیں کبھی نہیں گزرتیں۔ یہ ہمارے بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے تک چلی آتی ہیں۔ یہ سب جانتے ہیں سب مانتے ہیں کہ حسرتیں ہمیشہ جوان رہتی ہیں۔ پھر ہم بوڑھے کیسے ہو گئے؟ کیا ہماری حسرتیں مر گئی ہیں یا ہم مسرتوں کے بغیر خالی ڈبوں اور خالی بوتلوں کی طرح نئی نسل کے اسٹور روم میں رکھ دیئے گئے ہیں؟

نہیں ظلّے! جب انسان آخری سانس لیتا ہے اس وقت بھی [illegible] ر سے خالی نہیں ہوتا۔ ہم متحرک ہیں۔ ہم متنفس ہیں جب تک سانس لیتے رہیں گے۔ تب تک اندر سے آباد رہیں گے جب تک آنکھ ہماری سوتی رہے گی۔ سپنے جاگتے رہیں گے۔ چغتائی نے کیا خوب کہا ہے۔

روز آکر گلے سے لگتے ہیں
خواب پھر بھی نئے سے لگتے ہیں
وقت آموختہ سا لگتا ہے
اور ہم بھولنے سے لگتے ہیں

ظلّے! ہم نہیں بھولیں گے۔ ہماری تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے۔ ہم نے زندگی کے جس سبق کو یاد کیا اسے ازبر کر لیا۔ پھر جوانی کا سبق کیسے بھول سکتے ہیں۔ جو سبق پڑھا ہے۔ اسے دہرا بھی سکتے ہیں بشرطیکہ یادداشت سلامت ہو۔ تو آؤ' ہم اپنی یادداشت کو آزمائیں۔ شاید جوانی کے سبق کو بڑھاپے میں دہرانے کی ایک نئی مثال قائم ہو جائے۔

اسی لئے میں جا رہی ہوں۔ یاد کرو۔ شادی سے پہلے میں اپنے گھر سے بھاگی تھی۔ اس لئے کہ مجھے اپنا چاہنے والا چاہئے تھا۔ میں ایسا آئیڈیل چاہتی تھی جو مجھے تلاش کرے۔ جو میرے اندر سے مجھے دریافت کرے۔ مجھے پہچانے' مجھے سمجھے اور پھر قبول



کرے۔"

ظلِ سبحانی نے پڑھتے پڑھتے ذرا رک کر ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے اور کھڑے ہوئے افراد کو دیکھا' سب اس کے اور رُبا کے بچے تھے۔ انہوں نے اپنی ماں کا سارا دودھ اور اپنے باپ کا سارا خون چوس لیا تھا۔ تب ہرے ہوئے تھے۔ بھرے ہوئے تھے اور ماں باپ کو پیڑ کی طرح سکھا کر رکھ دیا تھا۔ ظلِ سبحانی نے خط کے کاغذ کو پلٹ کر دوسری طرف پڑھنا شروع کر دیا۔ رُبا نے لکھا تھا۔

"تب میں جوان تھی' نادان تھی' نادان لڑکیوں کی طرح میں نے بھی یہ نہیں سوچا کہ میرے خاندان کی بدنامی ہوگی۔ میرے ماں باپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے اور میں گھر سے باہر نکل کر اپنی عزت کی آپ دشمن بن جاؤں گی۔ لوگوں کو اپنی طرف بڑھنے کا موقع دوں گی۔

ہائے' وہ سسپنس سے بھرپور لمحات. آج بھی مجھے یاد ہیں جب تم میرا پیچھا کر رہے تھے اور میں سہمی سہمی' چھپتی پھرتی تھی' جانے کہاں کہاں پناہ لیتی رہتی تھی۔ میں تم سے ڈرتی تھی مگر یہ ڈر اچھا لگتا تھا تم اجنبی لگتے تھے مگر دیرینہ شناسا کی طرح تھے۔ میرا دل کہتا تھا کہ میں تمہارے سائے میں رہنے کے لئے تمہارے سائے سے بھاگ رہی ہوں۔

آہ' اتنی زندگی گزارنے کے بعد یہ انکشاف ہوا کہ دور کی محبت پائیدار ہوتی ہے۔ قربت میں پیار تو بہت ملتا ہے لیکن عورت بھاگنے' چھپنے اور اپنے مرد کو ٹھینگا دکھانے کے حقوق سے محروم ہو جاتی ہے۔

لو' میں نے ٹھینگا دکھا دیا۔ پھر سے اپنے حقوق حاصل کر رہی ہوں۔ آؤ' اب مجھے ڈھونڈلو۔ پہلے میں موسم بہار تھی۔ مجھ میں بے پناہ کشش تھی۔ اب دیکھنا چاہتی ہوں کہ مجھ میں کیا ہے لیکن یاد رکھو۔ مجھے تلاش کرنے کے لئے چھڑی ٹیک کر نہ آنا۔ میں کسی بوڑھے کو لفٹ نہیں دوں گی۔

ظلّے! یہ ہماری زندگی کا آخری موسم ہے۔ گھر کی چار دیواری سے اور بچوں کے حصار سے باہر نکلو اور دیکھو۔ کیسے پھول کھلے ہیں۔ کیسے رنگ بکھرے ہیں' یہ دنیا اب بھی ویسی ہی خوبصورت ہے۔ ہماری جوان اولادوں نے ہمیں بوڑھا کہہ کر ہمارے لئے دنیا کو بوڑھا بنا دیا ہے مگر آؤ اور میری تلاش کی عینک لگا کر دیکھو' یہ دنیا ہمیشہ سے

زیادہ حسین اور جوان نظر آئے گی' آؤ ہم آزاد پنچھی کی طرح کھلے آسمان کے سائے میں یہ آخری موسم گزاریں فقط۔"

خط کی تحریر ختم ہوگئی۔ ظلِ سبحانی نے اسے بڑے پیار سے تہہ کیا۔ پھر اسے ٹھیک سینے کے پاس دھڑکتے ہوئے دل کے قریب اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے چھوٹے بیٹے راحت سبحانی کے صاحب زادے راحیل نے زینے کے نچلے حصے میں آکر سر اٹھاتے ہوئے اپنے دادا جان کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "آپ کو دیر نہیں کرنا چاہئے۔ دادی جان زیادہ دور نہیں گئی ہوں گی۔ اس انتظار میں ہوں گی کہ آپ انہیں تلاش کرنے کے لئے گھر سے نکلتے ہیں یا نہیں۔ وہ آپ کے ذرا سمجھانے منانے پر واپس آجائیں گی۔"

ظلِ سبحانی نے اپنی چھڑی اٹھا کر اپنے پوتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"راحیل! تمہاری عمر کیا ہے؟"

"اٹھارہ برس۔"

"ابھی اور اٹھارہ برس گزارو۔ تب اپنی دادی کو سمجھ سکو گے۔ اسے آس پاس کہیں انتظار کرنا ہوتا یا میرے سمجھانے منانے پر اتنی جلدی واپس آنا ہوتا تو وہ اپنے اور زیورات لے کر اور میرے ایک لاکھ روپے لے کر کیوں جاتی؟"

بڑے بیٹے جمال سبحانی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ابا جان! ہمیں فوراً انسپکٹر صابری کو بلانا چاہئے' موجودہ معاملات میں اس سے مشورہ لینا چاہئے۔"

ظلِ سبحانی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اور تمہاری امی کے خلاف تھانے میں رپورٹ درج کرانا چاہئے۔"

جمال سبحانی نے کہا۔ "صابری ہمارا خالہ زاد بھائی ہے۔ وہ یا قانون کا کوئی بھی محافظ آپ کو یہی مشورہ دے گا۔ تھانے میں رپورٹ درج ہونی چاہئے۔ یہ اس لئے نہیں کہ امی جان گھر سے زیورات اور روپے لے گئی ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ روپے اور زیورات ان کی جان کے دشمن بن جائیں گے۔ پتہ نہیں کتنے غنڈے' بدمعاش' ڈاکو ان کا پیچھا کریں گے۔"

"یہ سوچنا میرا کام ہے۔ میری بیوی میرے روپے اور زیورات لے کر گئی ہے لیکن وہ تمہاری ماں ہے تم کیسے بیٹے ہو کہ اس بات کو تقریباً دو گھنٹے گزر چکے ہیں اور تم یہاں کھڑے ہوئے اپنی ماں کے متعلق تبصرہ کر رہے ہو۔ اس حساب میں لگے ہو کہ



تمہاری ماں کے پاس کتنی رقم تھی اور وہ کتنی رقم لے کر گئی ہے۔ کیا تم انہیں تلاش کرنے کے لئے نہیں جاسکتے تھے یا اب بھی نہیں جاسکتے؟"

"آپ دو گھنٹے کی بات کہہ رہے ہیں۔ میں چار گھنٹے کے بعد بھی جاسکتا ہوں۔ وہ میری امی ہیں۔ میں ان سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ یہ میرا اللہ جانتا ہے لیکن جانے سے پہلے مناسب کارروائی کرنی چاہئے۔ یہ معلوم ہونا چاہئے کہ انہوں نے اپنے پیچھے کیا چھوڑا ہے۔ آپ ابھی فرما رہے تھے کہ ان کے اکاؤنٹ میں اسی پچاسی لاکھ روپے تھے۔ وہ روپے اب ہیں یا نہیں کیا آپ بتا سکتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ انہوں نے جانے سے پہلے وہ تمام رقم بھی نکال لی ہو؟"

بانو بے مثال نے کہا۔ "بھائی جان! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں کیا امی اتنی ساری دولت کی گٹھری بنا کر اپنے سر پر اٹھا کر لے جائیں گی؟"

جمال سبحانی نے غصے سے کہا۔ "تم ہمارے بیچ میں نہ بولو۔ تمہارے خیال کے مطابق ہم دونوں بھائی لالچی ہیں۔ ہمارے بیوی بچے' امی کو نہیں ان کی دولت کو چاہتے ہیں۔ اتنے بڑے گھر میں ایک تم ہی ہو جو پیسے کو سونگھ کر چھوڑ دیتی ہو۔ ٹھیک ہے کہ وہ گٹھری بنا کر سر پر رکھ کر نہیں لے جاسکتیں لیکن اپنی تمام رقم مختلف بنکوں سے نکال کر کسی دوسری جگہ منتقل تو کر سکتی ہیں۔"

راحت سبحانی نے کہا۔ "بھائی جان! اس کے لالچی سمجھنے سے ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہمیں فوراً ہی مناسب کارروائی کرنی چاہئے۔ میں ابھی انسپکٹر صابری کو فون کرکے بلاتا ہوں۔"

وہ پلٹ کر فون کی طرف جانے لگا۔ بانو نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "بھائی جان! آپ تکلیف نہ کریں۔ میں پہلے ہی صابری کو اطلاع دے چکی ہوں۔ وہ آنے ہی والے ہیں۔"

راحیل نے مسکرا کر کہا۔ "بانو پھوپھی! کیا بات ہے؟ انکل صابری کا نام لیتے وقت آپ دوپٹہ سر پر رکھ لیتی ہیں۔"

بلی نے کہا۔ "یہ مشرقی آداب ہیں' بانو پھوپھی نے دادی اور دادا جان کو خوش کرنے کی بڑی پریکٹس کی ہے۔"

ظلِ سبحانی نے اوپری زینے پر سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ بچے

بہت ہی منہ پھٹ ہو گئے ہیں' اللہ انہیں عقل دے۔"

پھر انہوں نے بڑے بیٹے کو مخاطب کیا۔ "جمال! میں تمہاری ماں کو تلاش کرنے جاؤں گا لیکن اس سے پہلے وکیل صاحب سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ انہیں فون کرو۔ میری طرف سے درخواست کرو کہ وہ جلدی آکر مجھ سے ملاقات کریں۔"

دونوں صاحبزادے' ان کی بیگمات اور دوسرے بچے بھی زینے کی طرف سمٹ آئے' سب سوالیہ نظروں سے ظلِ سبحانی کو دیکھ رہے تھے......... وہ چھڑی ٹیکتا ہوا برآمدے سے گزرتا ہوا اپنی خواب گاہ کی طرف جارہا تھا۔ جمال سبحانی نے کہا۔ "اباجان! آپ امی کو تلاش کرنے جائیں گے۔ وکیل سے ملنا کیا ضروری ہے' ابھی جائیں گے شام تک واپس آجائیں گے۔"

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ پھر پلٹ کر نیچے ڈرائنگ روم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "نہیں' تمہاری ماں نے کہا ہے کہ میں چھڑی ٹیک کر اسے تلاش کرنے کے لئے نہ نکلوں۔ اس نے ٹھیک ہی کہا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ذرا خاموش ہوا۔ چھت کی طرف منہ اٹھا کر ایک سرد آہ بھر کر دل میں کہنے لگا۔ "انسان کی کوئی آرزو کبھی لاٹھی ٹیک کر جانِ آرزو تک نہیں جاتی۔ میں بھی نہیں جاؤں گا۔ بغیر چھڑی کے کمر سیدھی کر کے چلوں گا۔"

چھوٹی بہو نے پوچھا۔ "اباجان! آپ کہتے کہتے خاموش کیوں ہو گئے۔ کیا سوچ رہے ہیں۔ کیا آپ ان کو تلاش کرنے جائیں گے تو شام تک واپس نہیں آئیں گے؟"

ظلِ سبحانی نے انکار میں سرہلاتے ہوئے کہا۔ "جب تک وہ مجھے نہیں ملے گی۔ میں نہیں آؤں گا اور جب چھڑی ٹیک کر نہیں چلوں گا تو پتہ نہیں کہاں کہاں ٹھوکریں کھاؤں گا۔ ہو سکتا ہے۔ کہیں ایسے گروں کہ پھر اٹھ نہ سکوں۔ دانش مندی یہی ہے کہ جانے سے پہلے وکیل اور ڈاکٹر کی موجودگی میں ایک وصیت لکھ دوں۔"

دونوں بیٹے تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے باپ کی طرف لپکے اور ان کے قریب پہنچ کر ہانپتے ہوئے کہنے لگے۔ "اباجان! وصیت لکھیں آپ کے دشمن' ٹھوکریں کھائیں آپ کے دشمن' آپ امی کو تلاش کرنے نہیں جائیں گے۔ آپ گھر میں آرام سے بیٹھیں۔ ہم انہیں تلاش کریں گے۔" وہ کچھ اور قریب آگئے۔ ظلِ سبحانی نے کہا۔ "میں نے تم لوگوں کو وہ خط پڑھ کر سنا دیا ہے۔ اس میں صاف طور سے لکھا



ہے کہ میں تمہاری امی کو تلاش کرنے جاؤں۔ لہٰذا میں جاؤں گا۔ کوئی میرے ساتھ نہ آئے۔ کوئی میرا پیچھا نہ کرے۔ جسے اپنی ماں سے اور دادی سے محبت ہے وہ اپنے طور پر انہیں تلاش کرے۔ اس وقت میں تنہائی چاہتا ہوں۔ جب وکیل صاحب آئیں تو مجھے بلا لینا۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی خواب گاہ میں واپس آیا۔ پھر دروازے کو بند کر کے اندر سے لاک کر دیا۔ جب کوئی بچھڑ جاتا ہے تو اس سے منسوب رہنے والی تمام چیزیں اس کی یاد دلاتی ہیں' وہاں کی ہر چیز زُبا سے منسوب تھی۔ حتیٰ کہ خواب گاہ میں سانس لینے والی ہوائیں بھی زُبا کے دم قدم سے تھیں اور اب ظلِ سبحانی کو ان چیزوں سے اس کی یاد آنے والی تھی۔ اس نے پلٹ کر کمرے میں ایک ایک چیز کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ وہ غیر شعوری طور پر زُبا کی یادوں کو بلا رہا تھا۔

شوہروں کے لئے بڑی مشکل ہے۔ بیویاں چھوڑ کر چلی جائیں تو یاد نہیں آتیں۔ بڑی مشکلوں سے یاد کرنا پڑتا ہے سو جتن کئے جاتے ہیں۔ کبھی تنہائی میں بیٹھ کر آہیں بھرتے ہیں کہ یاد آجائے۔ آنکھوں میں یاس اور محرومی کے تمام جذبات سمیٹ لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تھوک نگل نگل کر اس کا نام لے لے کر چٹانوں میں پکارا جاتا ہے۔ آخر انکشاف ہوتا ہے کہ وہ نیک بخت خیالوں سے پہلے ہی چلی گئی تھی۔ بعد میں گھر سے گئی ہے۔

ظلِ سبحانی نے ایک سرد آہ کھینچی۔ پھر ایک دم سے ہڑبڑا گیا۔ اسے اپنی نگاہوں کے سامنے ایک حسین دوشیزہ نظر آرہی تھی' یہ بھی شوہروں کا ایک المیہ ہے۔ وہ باسی کو یاد کرتے ہیں اور باسی انہیں تازہ نظر آتی ہے۔ اس کے ہاتھ سے چھڑی گر پڑی۔ بے اختیار اس نے کمر سیدھی کر لی۔ سینہ تان کر دیکھا۔ غور سے دیکھا تو وہ زُبا تھی۔ آج سے بیالیس سال پہلے کی زُبا۔ اٹھارہ برس کی دوشیزہ۔

کیسا سیدھا سادا سا حسن تھا۔ ان دنوں چیختے ہوئے میک اپ کا رواج نہیں تھا۔ وہ اسی طرح سادگی سے بیالیس برس بعد واپس آگئی تھی۔ اس کے گالوں پر گلاب کھل رہے تھے۔ وہ آنکھوں میں حیا اور ہونٹوں پر مسکراہٹوں کے زیور پہنے ہوئے تھی۔ اس نے اپنے خط میں لکھا تھا۔ آخری موسم ہے آجاؤ۔ وہ جاتے جاتے عمرِ رفتہ کو آواز دے کر گئی تھی اور یوں سبک رفتگی سے اپنی بچھڑی ہوئی عمر کو منا کر لے آئی تھی۔

ظلِ سبحانی نے حیرانی سے پوچھا۔ "زبا! یہ تم ہو؟"

"ہاں، میں ہوں۔ کیا تم اتنی جلدی مجھے بھول گئے ہو؟"

"کل رات تک جو زبا میرے ساتھ تھی۔ میں نے اسے نہیں بھلایا ہے۔ اس کا سراپا اور چہرے کے نقوش اب بھی مجھے یاد ہیں لیکن تم تو ہوشربا ہو۔ تم پھول سے کلی کلی سے بند کلی کیسے بن گئیں؟ یہ جوانی کہاں سے لائی ہو؟"

"جوانی انسان کے خیالوں میں، اس کے ارادوں میں اور اس کے حوصلوں میں ہوتی ہے۔ میں نے بار بار تمہیں سمجھایا کہ چلو ان جوان بچوں کے ماحول سے نکل بھاگیں۔ یہ بچے ہمارے دشمن ہیں۔ ہمارا کھاتے ہیں اور ہمیں احساسِ کمتری میں مبتلا کرتے ہیں۔ یہ ہمارے منہ پر احتراماً امی جان اور ابا جان کہتے ہیں۔ پیٹھ پیچھے بڑی بی اور بڑے میاں کہہ کر ہماری عمر پر طنز کرتے ہیں۔"

"انہیں طنز کرنے دو۔ وہ بچے ہیں۔ نادان ہیں۔"

"نہیں ظلے! یہ نادانی نہیں، جانی بوجھی سازش ہے۔ ہمیں نفسیاتی مار ماری جاتی ہے۔ وہ ہمیں کیا سمجھتے ہیں؟ بوڑھا، ضعیف؟ جبکہ آج کی نسل ہم سے زیادہ بوڑھی اور ضعیف ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میں دسمبر کی سردی میں اذان سے پہلے بیدار ہوتی ہوں۔ ٹھنڈے پانی سے وضو کرتی ہوں۔ ان ٹھنڈے پانی کو میری بہو ہاتھ لگاتی ہیں تو انہیں زکام ہوجاتا ہے۔ میں بالکل نارمل حالت میں نماز ادا کرتی ہوں۔ ایمان سے کہو۔ ضعیفی ہم میں ہے یا ان میں؟"

ظلِ سبحانی نے کہا۔ "ایک راز کی بات بتاؤں۔ یہ جو نسل ہے یہ خود احساس کمتری میں مبتلا ہے۔ یہ نوجوان اپنی دنیا کو ہمارے ماضی کی طرح خوبصورت نہیں بنا ہیں تو بے طرح جھنجلاتے ہیں۔ سارا الزام اپنے بزرگوں پر دھرتے ہیں پھر بھی انہیں خوب صورتی کا راز نہیں ملتا تو منشیات کے عادی بن جاتے ہیں۔"

"تم اپنی سناؤ۔ میرے گھر سے بھاگ جانے پر جھنجلا رہے ہو۔ کیا مجھے نہ پاؤ گے منشیات کے عادی بن جاؤ گے؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "کیسی باتیں کررہی ہو۔ تم میرے پاس آگئی ہو مگر مجھے یقین نہیں آرہا۔ کیا میں تمہیں چھولوں؟"

"مجھے ہاتھ لگاؤ گے تو میں گم ہوجاؤں گی۔ میں تمہارے سامنے ہوں لیکن تم



اسی وقت گلیوں میں بھٹک رہی ہوں۔ اس انتظار میں کہ میرا چاہنے والا میرے پیچھے آئے گا، مجھے تلاش کرے گا، مجھے اپنے گھر لے جائے گا۔"

"زبا! اس عمر میں تم نے گھر سے بھاگ کر اچھا نہیں کیا۔"

"تم کس عمر کی بات کررہے ہو۔ کیا گھر سے بھاگنے کے لئے کوئی عمر مقرر ہے۔ کیا ہماری تہذیب کے کسی صفحے پر لکھا ہوا ہے کہ ہماری پوتی جینز اور جیکٹ پہن کر پوپ سنگیت پر رقص کرے اور میں سر پر آنچل رکھنے والی اپنے ماضی کے حسین لمحات کو نہ دہراؤں۔ کیا محبت جوانی میں جائز اور بڑھاپے میں ناجائز ہوجاتی ہے؟"

ظلِ سبحانی نے تائید میں سرہلا کر کہا۔ "تمہارا سوال بہت ہی غور طلب ہے۔ اس کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ محبت کو جوانی میں ناجائز قرار دیا جائے اور بڑھاپے میں جائز۔ کیونکہ بڑھاپے میں ہم گناہ نہیں کرسکتے۔ اس عمر میں محبت ہوس سے پاک، بے داغ اور معصوم ہوتی ہے۔ بڑی عجیب بات ہے کہ یہ عقل وفہم سے بھری ہوئی دنیا بڑھاپے کا مذاق اڑاتی ہے اور معصوم یادوں اور محبتوں کو مضحکہ خیز کہتی ہے۔"

"اسی لئے تو کہتی ہوں۔ چلے آؤ۔ ہم مذاق اڑانے والوں کا سامنا کریں گے۔ محبت کی ایک نئی مثال قائم کریں گے۔"

"زبا! ہم زبان سے جتنا بھی چیختے رہیں، فریاد کرتے رہیں، اپنے حقوق منواتے رہیں مگر عملی طور پر حوصلہ نہیں ہوتا۔"

"حوصلہ ہوتا ہے میں نے رفیق کو بھی اطلاع دے دی ہے۔"

رفیق کا نام سن کر ظلِ سبحانی چونک گیا۔ اس نے غصہ سے تھرتھر کانپتے ہوئے کہا۔ "رفیق یعنی میرا رقیب؟ میں اسے گولی ماردوں گا۔ کیا تم اس سے پھر ملنے لگی ہو؟"

"تمہیں بہت جلدی غصہ آجاتا ہے۔ یہ اچھی بات نہیں ہے تم یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ رفیق تم سے پہلے میرا طلبگار تھا۔ اس نے میرے والدین سے میرا رشتہ مانگا تھا۔ میں خود ہی اس رشتے سے انکار کرکے گھر سے بھاگ گئی تھی۔ پھر تم سے سامنا ہوا تھا۔"

"گھر سے بھاگنے کا مطلب یہی ہے کہ تم رفیق کو پسند نہیں کرتی تھیں۔"

زبا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آج پھر میں گھر سے بھاگ گئی ہوں گویا اب تمہیں پسند نہیں کرتی ہوں۔"

وہ پھر ایک بار ہنستے ہوئے بولی۔ "یہ اچھی طرح یاد رکھو۔ عورت اپنے دوسرے چاہنے والوں کو اگر نہیں چاہتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ناپسندیدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ چاہت سے انکار کر کے اپنی قدر و قیمت کا اندازہ بھی کرتی ہے۔"

"کیا اتنی عمر گزارنے کے بعد بھی اندازے کر رہی ہو کیا اب بھی یقین نہیں آیا کہ تمہاری قدر و قیمت میری نظروں میں کتنی ہے۔"

"یقین دلانا چاہتے ہو تو آجاؤ۔ آج سے بیالیس برس پہلے جب تم میرے پیچھے آئے تھے تو میرے پاس حسن و شباب کا سرمایہ تھا۔ آج میں خالی ہوں۔ آخری موسم سے کچھ مانگنے نکلی ہوں۔ دیکھتی ہوں مجھے کیا ملتا ہے۔"

اچانک دروازے پر دستک سنائی دی۔ ظلِ سبحانی نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر دوبارہ گھوم کر ادھر دیکھا مگر اب وہاں زُبا نہیں تھی۔ اس نے جھنجلا کر چیختے ہوئے پوچھا۔ "کون ہے؟"

باہر سے آواز آئی۔ "اباجان! میں جمال ہوں۔"

"کیوں آئے ہو؟"

"وکیل صاحب آئے ہیں۔"

"جاؤ' میں ابھی آجاؤں گا۔"

دروازے کے دوسری طرف خاموشی چھاگئی ظلِ سبحانی کو جب اطمینان ہوگیا تو اس نے پلٹ کر پھر اس جگہ دیکھا جہاں زُبا کھڑی ہوئی تھی لیکن اب وہ نہیں تھی۔ اس نے تڑپ کر دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھا۔ پھر رازدارانہ سرگوشی میں آواز دی۔ "کہاں ہو' آجاؤ۔ اب بچے ہمارے درمیان نہیں آئیں گے۔"

وہ نہیں آئی۔ اس کی آواز بھی نہیں آئی۔ اس نے اپنے دل کو دھڑکتے ہوئے صاف طور پر محسوس کیا۔ پھر اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر ایک ہاتھ رکھ دیا تب اسے پتہ چلا کہ زُبا وہیں ہے۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر خط نکال لیا۔ وہ خط ایک بلاوا تھا۔

"آجاؤ' بس آجاؤ۔"

اس نے ایک گہری سانس لی۔ سر کو جھکا کر وہاں سے چلتا ہوا دروازے تک آیا۔ اس کی چھڑی فرش پر پڑی تھی۔ باہر جانے کے لئے سہارے کی ضرورت تھی۔ اس نے چھڑی کو دیکھا مگر دروازہ کھولتے ہوئے بڑے حوصلے سے اپنی کمر سیدھی کی ذرا



ڈگمگاتے ہوئے آگے بڑھتے ہوئے بالکونی کی ریلنگ کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ نیچے گھر کے تمام افراد موجود تھے۔ وہاں وکیل صاحب اور انسپکٹر صابری کا اضافہ ہوگیا تھا۔

انہوں نے ظلِ سبحانی کو سلام کیا۔ پھر وکیل صاحب نے کہا۔ "جناب! آپ کی بیگم صاحبہ کل میرے دفتر میں آئی تھیں۔ انہوں نے آپ کی طرف سے ایک وصیت نامہ مرتب کرایا ہے' آپ اسے سن لیں۔ آپ کو اس وصیت نامے سے اتفاق ہو تو اپنے دستخط کر دیں۔"

ظلِ سبحانی خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وکیل کی بات ختم ہونے پر کوٹھی کے ہال نما ڈرائنگ روم میں سناٹا چھا گیا تھا۔ ایک تجسس تھا پتہ نہیں زُبا کس قسم کا وصیت نامہ لکھ کر گئی ہے۔

ظلِ سبحانی اطمینان سے چلتا ہوا زینے کے اوپری حصے پر پہنچا۔ اسی وقت ایک ملازم نے آکر کہا۔ "ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔"

ظلِ سبحانی نے کہا۔ "آنے دو۔"

پھر وہ آہستہ آہستہ سنبھل سنبھل کر ایک ایک زینہ اترنے لگا۔ ہاتھ میں چھڑی نہیں تھی۔ وہ کسی وقت بھی زینے سے گر سکتا تھا۔ اچھے صحت مند نوجوان بھی زینے کی ریلنگ کو تھام کر چڑھتے اترتے ہیں جسم بوڑھا نہیں ہوتا' پرانا ہوتا ہے۔ حوصلے نہ تو پرانے ہوتے ہیں' نہ بوڑھے۔ وہ جوان حوصلوں کے سہارے نیچے پہنچ گیا۔

تمام لوگ حیرانی سے یوں دیکھ رہے تھے جیسے کوئی بازی گر تنے ہوئے رستے پر کمالات دکھانے کے بعد صحیح سلامت زمین پر اتر آیا ہو اور اب فاتحانہ انداز میں یوں کھڑا ہو جیسے داد وصول کرنا چاہتا ہو۔ بلی نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ "ہیر یو آر دادا جان! معلوم ہوتا ہے آپ کی عمر کئی برس کم ہوگئی ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "سبحانی صاحب! جو لوگ حوصلے اور اعتماد سے زندگی گزارتے ہیں وہ کبھی بوڑھے نہیں ہوتے کبھی انہیں ڈاکٹروں اور دواؤں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بائی دی وے مجھے کیوں بلایا گیا؟ آپ تو ویل ٹوڈو ہیں۔"

وکیل اسرار احمد نے کہا۔ "آپ ان کا معائنہ کریں اور یہ سرٹیفکیٹ دیں کہ یہ بالکل صحت مند ہیں اور اپنے ہوش و حواس میں ہیں تاکہ یہ وصیت نامے پر دستخط کر سکیں۔"

ظلِ سبحانی ایک صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر ان کی نبض دیکھی۔ اسٹیتھسکوپ سے ان کے دل کی دھڑکنوں کو سمجھا۔ پھر انہیں کھانسنے کھکارنے کے لئے کہا۔ زور زور سے سانس لینے کی بھی فرمائش کی۔ زبان دیکھی آنکھوں میں جھانکا۔ پھر سوال کیا۔ "آپ کے جوڑوں کا درد کیسا ہے؟"

"میری گھر والی نے آج صبح سے ایسا شاک پہنچایا ہے کہ میں تمام دکھ درد بھول گیا ہوں۔"

انسپکٹر صابری نے پوچھا۔ "انکل! آپ کو کس وقت پتہ چلا کہ آنٹی گھر چھوڑ کر چلی گئی ہیں؟"

ظلِ سبحانی نے کہا۔ "صبح اذان کے وقت میری آنکھ کھلی تو بستر خالی تھا۔ میں باتھ روم سے منہ ہاتھ دھوئے بغیر واپس آیا۔ پلنگ کے سرہانے والی میز پر میرے نقلی دانت رکھے رہتے ہیں' جب میں انہیں اٹھانے گیا تو یہ خط ان دانتوں کے درمیان یوں رکھا ہوا تھا جیسے میں نے دانتوں سے پکڑ کر رکھا ہو۔ عجیب عورت ہے اپنا خط پہنچانے کے لئے اس نے میرے ہی دانتوں کو استعمال کیا تھا۔"

اس نے وہ خط انسپکٹر صابری کو دے دیا۔ ڈاکٹر اب ایک طرف بیٹھا ہوا میڈیکل رپورٹ لکھ رہا تھا۔ صابری نے خط پڑھنے کے دوران مسکراتے ہوئے چور نظروں سے بانو بے مثال کی طرف دیکھا۔ اتفاق سے بانو بھی اسے دیکھ رہی تھی نظریں ملتے ہی وہ جھینپ گئی۔ جلدی سے دوسری طرف منہ پھیرلیا۔ صابری نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہماری آنٹی بہت ہی زندہ دل ہیں۔ کتنا رومان پرور خط لکھا ہے۔"

راحیل نے کہا۔ "دادا جان کچے دھاگے سے بندھے جائیں گے۔"

بلی نے کہا۔ "انکل صابری! لگتا ہے آپ بھی کچے دھاگے سے بندھے ہوئے ہیں۔ کیوں بانو پھوپھی؟"

بانو ایک دم سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پھر اس نے ظلِ سبحانی سے کہا۔ "ابا جان! آپ انہیں لگام دیں ورنہ میں چلی جاؤں گی۔"

صابری نے کہا۔ "بانو! بیٹھ جاؤ۔ یہ راحیل اور بلی کے چہکنے کی عمر ہے تمہیں بچوں کے مذاق پر مسکرانا چاہئے۔ زندہ دلی کا ثبوت دینا چاہئے۔"

بانو منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ ظلِ سبحانی نے وکیل سے کہا۔ "مسٹر اسرار احمد! آپ وہ



وصیت نامہ پڑھ کر سنائیں۔"

اسرار احمد نے اپنی فائل کو اپنے زانو پر رکھا۔ پھر اسے کھول کر کہا۔ "اسے بیگم صاحبہ نے آپ کی طرف سے لکھوایا ہے۔ ذرا توجہ سے سنیں۔"

بلی نے کہا۔ "خواتین سے درخواست ہے کہ سر پر آنچل رکھ لیں۔"

اسرار احمد وصیت نامے کو پڑھنے لگا۔ اس میں لکھا تھا۔

"میں ظلِ سبحانی ولد رحمت سبحانی باہوش وحواس یہ وصیت نامہ اپنے وکیل اسرار احمد اور اپنے فیملی ڈاکٹر جبار توفیق کے سامنے لکھوا رہا ہوں۔

مورخہ ۶ ستمبر ۱۹۸۰ء کی شب میری زوجہ زُبابہ خاتون گھر چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔ میں بھی ان کی تلاش میں ۷ ستمبر کو گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

وصیت نامے کا یہ پیراگراف سنتے ہی ظلِ سبحانی نے چونک کر پوچھا۔ "مسٹر اسرار احمد! اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو میری بیگم کے گھر چھوڑنے کا علم پہلے سے تھا یعنی کل آپ جان گئے تھے مگر آپ نے مجھے نہیں بتایا؟"

اسرار احمد نے جواب دیا۔ "آپ کی بیگم نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ سب کچھ آپ کے اور ان کے باہمی سمجھوتے سے ہو رہا ہے۔ ایک دن پہلے وہ گھر چھوڑ کر جائیں گی۔ دوسرے دن آپ جائیں گے۔ میں مطمئن تھا اس لئے میں نے آپ سے ذکر نہیں کیا' کیا آگے پڑھوں؟"

ظلِ سبحانی نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔ "پڑھئے۔"

وہ پڑھنے لگا۔ آگے ظلِ سبحانی کی طرف سے لکھا گیا تھا۔ "میں نہیں جانتا کہ زُبابہ کو تلاش کرنے میں کتنا عرصہ لگے گا۔ ہو سکتا ہے کہ میں گھر سے نکلوں تو وہ اگلی گلی میں مجھے مل جائے' ہو سکتا ہے کہ اس تلاش میں میری عمر کا باقی حصہ گزر جائے' اس لئے میں یہ وصیت نامہ لکھ رہا ہوں۔

میرے اور زُبابہ کے بنک بیلنس' زیورات' زمین اور دوسری جائیداد کی تمام تفصیلات اس وصیت نامے کے ساتھ منسلک ہیں۔ اگر ہم کبھی لوٹ کر نہ آئے اور ہماری موت کی تصدیق ہو جائے تو تمام نقد رقم اور جائیداد کی تقسیم حسب ذیل ہوگی۔

گلشنِ شاداب کی کوٹھی نمبر ایف ۷ ہماری اولاد جمال سبحانی' راحت سبحانی اور بانو بے مثال کی مشترکہ رہائش کے لئے وقف ہوگی۔ اس کوٹھی میں وہ اپنی اولاد کے

ساتھ تاحیات رہ سکتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے وہ کوٹھی میں نہ رہنا چاہیں تو کوٹھی نمبر ایف ۷ کو فروخت کرکے اس سے جو رقم حاصل ہو اسے یونیٹی بنک کے اکاؤنٹ نمبر۱۰۹۹۶ میں جمع کردیا جائے۔"

جمال سبحانی نے کہا۔ "یہ کیا بات ہوئی؟ ابا جان! کیا یہ کوٹھی ہم میں سے کسی کی ملکیت نہیں ہوگی؟"

ظلِ سبحانی نے کہا۔ "آگے سنو' کیا لکھا ہے۔"

اسرار احمد آگے پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔ "۷ ستمبر ۱۹۸۰ء سے زبابہ ٹیکسٹائل ملز کا کاروبار' بورڈ آف ڈائریکٹرز کے تحت جاری رہے گا۔ اس بورڈ کے ڈائریکٹرز کے نام حسبِ ذیل ہیں۔

زبابہ ٹیکسٹائل ملز کے جنرل منیجر عتیق الرحمان' نمبر۲ زبابہ ٹیکسٹائل ملز کے چیف اکاؤنٹنٹ مسٹر شکیل الرحمان' نمبر۳ وکیل اسرار احمد' نمبر۴ جمال سبحانی' نمبر۵ راحت سبحانی' نمبر۶ انسپکٹر زبیر صابری' نمبر۷ بانو بے مثال۔

انسپکٹر زبیر صابری اور بانو بے مثال کے لئے لازمی ہے کہ وہ تیس دن کے اندر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوجائیں۔ اگر انہوں نے اس شرط پر عمل نہ کیا تو وہ ڈائریکٹرز کی حیثیت سے کاروبار میں شریک نہیں رہیں گے۔ بانو بے مثال کو صرف ایک ہزار روپے ماہانہ ادا کئے جائیں' شادی ہونے کے بعد بانو بے مثال' زبیری صاحب اور دوسرے ڈائریکٹرز تین ہزار روپے ماہانہ حاصل کرسکتے ہیں۔ کاروبار ترقی پر ہو اور منافع کی شرح بڑھتی جائے تو اس کے مطابق ڈائریکٹرز کے معاوضوں میں بتدریج اضافہ ہوسکتا ہے۔ زبابہ ٹیکسٹائل ملز کی تمام آمدنی بھی یونیٹی بنک کے اکاؤنٹ نمبر۱۰۹۹۶ میں جمع کی جائے۔"

راحت سبحانی کی بیگم نے کہا۔ "یہ امّی جان نے وصیت نہیں لکھائی' اپنی اولاد سے دشمنی کی ہے۔"

راحت سبحانی نے بھڑک کر کہا۔ "یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ہم ٹیکسٹائل ملز کے مالک بھی نہیں رہے' صرف ڈائریکٹرز ہیں۔ صرف تین ہزار روپے پانے والے ملازم ہیں۔"

ظلِ سبحانی نے کہا۔ "محنت کروگے' کاروبار کو ترقی دوگے تو معاوضہ بڑھتا جائے



گا۔ یہ وصیت نامے میں صاف طور پر لکھا ہوا ہے۔"

جمال سبحانی نے پوچھا۔ "ابا جان! کیا آپ امّی کے اس وصیت نامے سے متفق ہیں؟"

ظلِ سبحانی نے کہا۔ "اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر میں اعتراض کروں۔"

جمال سبحانی کی بیگم یعنی بڑی بہو نے پوچھا۔ "یہ یونیٹی بنک کا اکاؤنٹ نمبر آخر کس کا ہے؟ کچھ معلوم تو ہو؟"

ظلِ سبحانی نے کہا۔ "یہ میرا اور زبابہ کا مشترکہ اکاؤنٹ ہے۔"

"لیکن آپ دونوں کے مرنے کے بعد............"

بڑی بہو کہتے کہتے رک گئی' اچانک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ جلدی سے سنبھل کر بولی۔ "اللہ تعالیٰ آپ دونوں کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے لیکن اس اکاؤنٹ میں جو لاکھوں کروڑوں روپے جمع ہوتے رہیں گے وہ آخر کس کام آئیں گے؟"

ظلِ سبحانی نے وکیل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "ہاں' بھئی اسرار احمد وہ رقم آخر کس کام آئے گی؟"

اسرار احمد پھر پڑھنے لگا۔ آگے لکھا تھا۔ "ہم میاں بیوی کے تمام بنک بیلنس' کاروبار اور جائیداد سے ہونے والی مستقل آمدنی کا حق دار کون ہے اس کی تفصیل ایک الگ وصیت نامے میں لکھی ہوئی ہے۔ وہ وصیت نامہ بنک کے لاکر میں ہے اور وہ لاکر زبابہ کے نام سے مخصوص ہے۔ جب ہماری موت کی تصدیق ہوجائے تو وکیل اسرار اس لاکر سے وصیت نامے کو نکال کر اس پر عمل کرنے کے مجاز ہیں۔"

گھر کے تمام افراد میں کھلبلی پیدا ہوگئی۔ وہ طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔

"ابا جان اس علیحدہ وصیت نامے میں کیا لکھا ہوا ہے' اتنی بڑی دولت اور جائیداد کا حق دار کون ہے؟"

"ابا جان! آپ ہمیں بتائیں کیا حقدار کوئی ایک ہے یا ہم سب ہیں؟"

ببلی نے کہا۔ "دادی جان جاتے جاتے ہماری بھوک اور ہماری نیندیں اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔ اب جانے کتنی راتیں جاگتے ہوئے اور سوچتے ہوئے گزریں گی۔

ہائے' اس لاکر سے کس کے نام کی لاٹری کھلے گی۔"

ظلِ سبحانی نے کہا۔ "میں خود نہیں جانتا کہ دوسرے وصیت نامے میں کیا لکھا ہے۔"

جمال سبحانی نے کہا۔ "ابا جان! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اتنا بڑا فیصلہ صرف امّی نہیں کر سکتیں۔"

"بیٹے! اسی لئے تمہاری امّی نے یہ وصیت نامہ لکھوایا ہے' اگر میں اس پر دستخط کروں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اس لاکر کے وصیت نامے سے اتفاق ہے۔"

"آپ کو معلوم تو ہونا چاہئے کہ اس وصیت نامے میں کیا لکھا ہوا ہے۔ اس پر بھی آپ کے دستخط ضروری ہیں۔"

"ایک بار تمہاری امّی نے ایک اسٹامپ پیپر پر مجھ سے دستخط کروالئے تھے۔ پتہ نہیں اس میں کیا لکھوایا ہے۔"

بڑی بہو نے کہا۔ "میں بولوں گی تو پرائی کہلاؤں گی۔ صاف بات تو یہ ہے کہ امّی نے بڑی ہوشیاری سے تمام دولت اور جائیداد اپنے نام لکھوائی ہے اور اسے لاکر میں محفوظ کردیا ہے۔"

جمال سبحانی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ابا جان! یہ سراسر فراڈ ہے۔ آپ اس وصیت نامے پر دستخط نہ کریں۔"

"بیٹے' یہ تمہاری ماں نے مجھ سے شاید آخری فرمائش کی ہے۔ کیا پتہ وہ اس دنیا کے کسی موڑ پر مجھے ملے گی یا نہیں' نہیں ملے گی تو یقیناً یہ اس کی آخری فرمائش ہے۔ میں ضرور دستخط کروں گا۔"

اسرار احمد نے دستخط کے لئے اس فائل کو ان کی طرف بڑھایا۔ چھوٹے بیٹے راحت سبحانی اور ان کی چھوٹی بہو اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر قریب آگئے۔ سب احتجاج کرنے لگے۔ التجائیں کرنے لگے۔ "ابا جان آپ دستخط نہ کریں۔ ابھی جلدی بھی کیا ہے ذرا اس وصیت پر غور کرلیں۔ آپ نے اتنی بڑی دنیا دیکھی ہے۔ اتنا بڑا کاروبار چلاتے ہیں۔ کچھ تو سمجھتے ہوں گے کہ کوئی بھی بڑا کام سوچے سمجھے بغیر نہیں کرنا چاہئے۔"

راحیل اور ببلی اپنے دادا جان کے دونوں طرف صوفے کے ہتھوں پر آکر بیٹھ



گئے۔ پہلے راحیل نے انہیں جھنجھوڑ کر کہا۔ "یہ وصیت نامہ نہیں ہمارے لئے سزا نامہ ہے۔"

ببلی نے دوسری طرف سے جھنجھوڑ کر کہا۔ "پتہ نہیں دادی جان نے ہمیں کس غلطی کی سزا دی ہے۔ اس وصیت نامے پر آپ دستخط کریں گے تو ہمارا تمام فیوچر برباد ہو جائے گا۔"

راحیل نے کہا۔ "دادا جان! پانچ دس ہزار روپے تو آپ مسجد میں اور فلاحی اداروں میں دے دیا کرتے ہیں۔ کیا میرے ڈیڈی اور ببلی کے پاپا اتنے گئے گزرے ہیں کہ انہیں تین ہزار روپوں کی خیرات ملا کرے۔"

ببلی نے کہا۔ "دادا جان! اِٹ از شیم فور یو اور فور آس۔ تین ہزار روپے میں تو موت بھی نہیں ملتی۔ زندگی کہاں سے ملے گی۔"

ظلِ سبحانی نے کہا۔ "تمہاری دادی جان نے خوب سوچ سمجھ کر یہ وصیت مرتب کرائی ہے۔ تین ہزار روپے میں تمہارے پاپا اور تمہارے ڈیڈی کو معلوم ہوگا کہ یہ دنیا کتنی مہنگی ہے اور لوگ عام حالات میں کس طرح زندگی گزارتے ہیں۔ کس طرح اپنی ضروریات سے لڑتے ہیں اور کس طرح اپنی کم سے کم آمدنی میں اپنے اخراجات پورے کرتے ہیں۔ اسرار صاحب! لائیے قلم دیجئے۔"

اسرار احمد نے اپنی جیب سے قلم نکال کر اس کی طرف بڑھایا وہ قلم لے کر اسے کھول کر فائل پر جھک گئے۔ اسی وقت جیسے زلزلہ آگیا۔ ببلی اچانک ہی دادا جان کی گردن میں بانہیں ڈال کر لپٹ گئی۔ دوسری طرف راحیل نے جھپٹ کر فائل لے لی پھر اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھتا۔ راحیل وہاں سے چھلانگ لگاتا ہوا دور چلا گیا۔ ظلِ سبحانی نے کہا۔ "ارے' یہ کیا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ببلی مجھے چھوڑو تو سہی۔"

ببلی اسے چھوڑ کر دوڑتی ہوئی راحیل کے پاس آگئی۔ انسپکٹر صابری نے کہا۔ "راحیل یہ کیا بدتمیزی ہے۔ فائل انکل کو واپس کرو۔"

راحیل نے کہا۔ "انکل! ہم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ آپ پولیس کے آدمی ہیں تو مجرموں کا محاسبہ کریں۔ یہ ہمارا گھریلو معاملہ ہے ہم اپنے دادا جان کے ساتھ شرارتیں کرسکتے ہیں۔ آپ اسے بدتمیزی کہہ لیں۔"

ببلی نے کہا۔ "انکل صابری! اگر آپ ہمارے گھریلو معاملات میں شریک ہونا

چاہتے ہیں تو پہلے بانو پھوپھی سے شادی کریں۔ اس سے پہلے آپ کو ہمارے معاملات میں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

جمال سجانی' راحت سجانی اور ان کی بیگمات کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ نگاہوں ہی نگاہوں میں راحیل اور بلی پر قربان ہو رہے تھے۔ یہ نئی نسل کتنی اسمارٹ ہے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ ادھر راحیل اور بلی پیچھے ہٹتے ہوئے دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ بلی نے کہا۔ "دادا جان! آج آپ کو فیصلہ کرنا ہوگا۔ آپ کو اپنے ماضی سے محبت ہے یا ہمارے مستقبل سے پیار ہے؟"

راحیل نے کہا۔ "دادا جان! آپ عمر کی اس منزل پر ہیں جہاں پرانی محبت ختم ہو جاتی ہے اور نئی محبت گلے لگتی ہے۔ ہم آپ کے گلے لگنے کا حق رکھتے ہیں۔ دادی جان کے پیچھے جانا صرف اس لئے ضروری ہے کہ انہیں باہر کی مشکلوں سے بچایا جائے لیکن عشقیہ انداز میں جانا اور ان کی ہر بات پر بے چون و چرا عمل کرنا دانش مندی نہیں ہے۔"

ظلِ سجانی نے اپنے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "نامعقول مجھے اس عمر میں دانش مندی سکھا رہے ہو۔ وہ فائل واپس کرو۔"

"ہم واپس کر دیں گے۔ ہمیں اتنی عقل ہے کہ اس وصیت نامے کی نقل وکیل صاحب کے پاس ضرور ہوگی۔ وہ دوسرا وصیت نامہ تیار کرلیں گے اور آپ اس پر دستخط کر دیں گے' ہم نے یہ فائل آپ سے چھین لی ہے تو یہ محض ایک احتجاج ہے۔ ہم نے سوچنے اور دستخط کرنے کے درمیان ایک وقفہ پیدا کیا ہے۔"

بلی نے کہا۔ "آپ وعدہ کریں کہ یہ وقفہ ایک ہفتے کا ہوگا۔ آپ ایک ہفتے تک غور کریں گے صرف دادی جان کی محبت میں ڈوب کر نہیں سوچیں گے۔ ہمارے ڈوبنے پر بھی غور کریں گے۔ آج سے ٹھیک ایک ہفتے بعد چودہ ستمبر کو اسی وقت ہم یہاں جمع ہوں گے اور آپ اپنا آخری فیصلہ سنائیں گے۔"

راحیل سجانی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ابا جان! ہمارے بچوں نے بہت اچھا قدم اٹھایا ہے۔ ایک ہفتے بعد بھی آپ نے اس وصیت نامے پر دستخط کئے اور ہمارے خلاف فیصلہ سنایا تو ہم یہ کوٹھی ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔"

راحیل نے کہا۔ "نہیں ڈیڈی! ہم یہ کوٹھی چھوڑ کر کبھی نہیں جائیں گے ہم دادا



جان کا بھی پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔"

ظلِ سجانی نے گرج کر پوچھا۔ "تم کیا کرو گے؟"

بلی نے کہا۔ "یہ نئی نسل بہت ضدی ہے۔ اپنی بات منوا کر رہتی ہے۔ اگر آپ نے ہمارا گلا کاٹنے کے لئے اپنے ماضی کو گلے لگایا تو ہم اس کوٹھی سے جلوس کی صورت میں نکلیں گے۔ ہمارے ہاتھوں میں بڑے بڑے بینرز ہوں گے اور ہم آپ کے خلاف نعرے لگائیں گے اس خاندان کی عزت خاک میں ملے گی آپ کا نام اخباروں میں اچھالا جائے گا۔"

"کیا تم مجھے دھمکی دے رہی ہو؟"

راحیل نے کہا۔ "بلی دھمکی نہیں دے رہی ہے بلکہ نئی نسل آپ سے اپنی عزت' اپنا مقام اور اپنا حق طلب کر رہی ہے۔ آپ لوگ الزام دیتے ہیں کہ ہم منشیات کے عادی ہو جاتے ہیں اس لئے کہ ہم بزرگوں کے غلط فیصلوں کی سزا پاتے ہیں اور محرومیوں سے دامن بچانے کے لئے نشے کا سہارا لیتے ہیں۔ اس کا فیصلہ ایک ہفتے بعد ہوگا۔ آپ وعدہ کریں۔ اس سے پہلے آپ وصیت نامے پر دستخط نہیں کریں گے۔"

ظلِ سجانی نے ایک گہری سانس لے کر انہیں دیکھا۔ پھر دونوں بازو ان کی طرف پھیلاتے ہوئے کہا۔ "میرے بچو' میرے پاس آؤ۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایک ہفتے تک اس وصیت نامے پر دستخط نہیں کروں گا۔"

بلی اور راحیل دوڑتے ہوئے آئے اور اپنے دادا جان کے بازوؤں میں سما گئے' ان کے والدین اور خاندان کے دوسرے افراد خوش ہو کر تالیاں بجانے لگے۔ اپنے پوتے پوتی کو سینے سے لگا کر اسے بھی بڑی خوشی حاصل ہو رہی تھی۔ بڑا سکون مل رہا تھا۔ اچانک ہی دروازے پر رُبا نظر آئی۔ وہی اٹھارہ برس کی دوشیزہ' اب اس نے لباس بدل لیا تھا۔ اگرچہ سامنے ہی دروازے پر کھڑی تھی لیکن دھنک رنگ لباس میں دور افق پر دکھائی دیتی تھی اور نیاز مندی چاہتی تھی۔ نیاز حاصل کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ محبوب کی ہر بات پر عمل کیا جائے' اسے ناراض ہونے کا موقع نہ دیا جائے اور یہ ناراض ہونے کا موقع تھا کہ اس نے وصیت نامے پر دستخط نہیں کیے تھے۔

اس نے پریشان ہو کر اپنے پوتے اور پوتی کو دیکھا پھر انہیں تھپک کر کہا۔ "میرے بچو! تمہاری دادی جان' تمہاری دشمن نہیں ہیں۔ اس نے جو کچھ بھی کیا ہے اس میں یقیناً تم سب کی بھلائی ہوگی۔ بہرحال ایک ہفتے بعد دیکھا جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے بچوں سے الگ ہوگیا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا دروازے تک آیا۔ زُبا نے ناراضی سے منہ پھیر لیا۔ اس نے کہا۔ "دیکھو زُبا! سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ ہمارے بچے ہیں۔ ایک ہفتے تک کے لئے میں نے ان کی ضد پوری کردی ہے۔ انہیں سمجھا بجھا کر وصیت نامے پر دستخط کروں گا۔"

زُبا نے اونہہ کہا اور وہاں سے چلی گئی۔ بانو بے مثال نے قریب آکر پوچھا۔ "ابا جان! آپ یہاں دروازے سے لگ کر کیوں کھڑے ہوگئے ہیں؟"

ظلِ سبحانی نے چونک کر بیٹی کو دیکھا۔ پھر خالی دروازے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہاری ماں' میرا مطلب ہے پتہ نہیں کہاں بھٹک رہی ہوگی۔ کہاں مل سکتی ہے' مجھے ابھی جانا چاہئے۔"

ملازم نے آکر کہا۔ "حضور! کوئی رفیق صاحب ملنے آئے ہیں۔"

رفیق کا نام سنتے ہی ظلِ سبحانی کے دماغ کو ایک جھٹکا لگا۔ رفیق نہیں آیا تھا رقیب آیا تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا کوٹھی کے برآمدے میں آیا۔ باہر لان میں رقیب بے چینی سے ٹہلتا ہوا نظر آیا۔ ظلِ سبحانی کو دیکھتے ہی آگے بڑھ کر بولا۔ "زُبا کہاں ہے؟"

ظلِ سبحانی نے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہوش میں تو ہو' تم اسے زُبا کہنے کا کیا حق رکھتے ہو' بیگم سبحانی کہو۔"

رقیب نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "کیا بیگم سبحانی کہنے سے یہ حقیقت بدل جائے گی کہ بیگم اپنے شوہر کو چھوڑ کر چلی گئی ہے؟"

ظلِ سبحانی ذرا تلملایا۔ پھر بولا۔ "جب تم جانتے ہو کہ وہ چھوڑ کر چلی گئی ہے تو یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

"میں تصدیق کرنے آیا تھا۔ تمہارے غصے نے ظاہر کردیا کہ وہ تمہارے لئے کانٹوں کا بستر بچھا گئی ہے۔"

وہ جانے لگا۔ ظلِ سبحانی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ٹھہرو تم اسے تلاش کرنے نہیں جاؤ گے۔"



وہ رک گیا۔ پھر پلٹ کر بولا۔ "مسٹر ظلِ سبحانی! ایک عقل کی بات تمہیں سمجھا دوں۔ جو چیز تمہارے گھر کی چار دیواری میں رہے۔ تمہارے اختیار میں رہے۔ اس کے لئے حکم صادر کرو میں تمہارے گل دان تک نہیں جاؤں گا لیکن جو پھول گلشن گلشن کھلتا ہے اس کی گل چینی کا حق کسی کو بھی حاصل ہو سکتا ہے۔"

چند لمحوں کے لئے ظلِ سبحانی پر سکتہ طاری ہوگیا۔ رقیب نے کیسی بات کہہ دی تھی۔ کیا زُبا گھر کی چار دیواری سے نکل کر گلشن کا پھول ہوگئی ہے۔ کسی کے بھی ہاتھ وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ وہ ایک دم سے لرز گیا۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ رقیب رُوسیاہ کوٹھی کے احاطے سے باہر جا رہا تھا۔ اس وقت یوں لگا جیسے زُبا آگے آگے ہو اور رقیب پیچھے پیچھے۔ وہ ایک دم سے تڑپ کر آگے بڑھا۔ رقیب کی رفتار سست تھی۔ وہ تیز رفتاری سے کوٹھی کے احاطے کے باہر آیا۔ پھر اس کے قریب پہنچ کر اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "بھئی کہاں جا رہے ہو؟ تم تو ناراض ہوگئے۔"

رقیب نے چلتے ہوئے کہا۔ "تم غصہ دکھا رہے تھے۔ ورنہ مجھے ناراض ہونا نہیں آتا۔ زُبا خوب جانتی ہے۔ میرا مزاج کیسا ہے۔"

ظلِ سبحانی کو برا لگا۔ "بیوی میری ہے اور مزاج تمہارا جانتی ہے' یہ کوئی شریفانہ گفتگو تو نہیں ہے۔"

"بہت سی باتیں اتنی سچ ہوتی ہیں کہ شریفانہ نہیں لگتیں۔ انہیں سن کر غصہ آتا ہے مگر یہ سچ ہے۔ زُبا میرے مزاج کو سمجھتی ہے۔ میں نے شادی کا پیغام بھیجا۔ اس کے والدین نے منظور کرلیا لیکن مجھے یہ سن کر حیرانی ہوئی کہ زُبا نے شادی سے انکار کردیا تھا۔ میں نے ایک بار اس کے آنگن میں جھانک کر اس سے پوچھا۔ تم نے انکار کیوں کیا؟ اس نے صاف صاف جواب دیا' تم تو بونگے ہو۔ ذرا بھی غصہ نہیں آتا۔ کبھی ناراض نہیں ہوتے میں کتنی ہی سخت باتیں کہہ دیتی ہوں اور تم ہنس کر ٹال دیتے ہو۔ کیا تم آدمی ہو؟"

ظلِ سبحانی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "زُبا نے کیا ہی اچھا سوال کیا تھا کہ کیا تم آدمی ہو؟ میں کہتا ہوں تم آج بھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔"

"دے سکتا ہوں۔ ان دنوں میں نوجوان تھا۔ نادان تھا' یہ نہیں سمجھتا تھا کہ

عورت صرف نرمی نہیں چاہتی۔ نرمی اور گرمی دونوں چاہتی ہے۔ جب وہ اپنے مرد سے محبت چاہتی ہے تو یہ بھی چاہتی ہے کہ وہ کبھی کبھی کانٹے کی طرح چبھتا رہے اور جب بھی چبھے پھونک پھونک کر مرہم بھی رکھتا رہے‘ میں نے برسوں کے بعد عورت کے مزاج کو کسی حد تک سمجھ لیا ہے اور میں نے غصہ کرنے کی اور موم سے فولاد بننے کی کافی پریکٹس کی ہے۔ اب وہ نظر آئے گی تو میں اسے غصہ دکھاؤں گا۔“

ظلِ سبحانی چلتے چلتے رک گیا۔ پھر اسے گھونسہ دکھاتے ہوئے بولا۔ ”خبردار میری بیوی ہے تم اسے غصہ نہیں دکھا سکتے۔“

”میں اس کے سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ بتانا چاہتا ہوں کہ میں آدمی ہوں۔“

”یہ اپنی گھر والی کو جا کر بتاؤ‘ ایں‘ مگر یہ ہم آ کہاں گئے ہیں؟ ہم باتوں ہی باتوں میں کہاں جا رہے ہیں؟“

”جس کی بات کر رہے ہیں‘ اسی کی تلاش میں جا رہے ہیں مگر وہ کہاں ملے گی؟“

”آہ‘ وہ کہاں ملے گی؟“ ظلِ سبحانی تھکے ہوئے انداز میں ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ان کے پیچھے ایک خوبصورت پارک تھا اور سامنے کشادہ سڑک تھی۔ رکشے‘ ٹیکسیاں‘ کاریں‘ بسیں اور جانے کتنی قسم کی گاڑیاں ہارن بجاتی‘ شور مچاتی گزرتی جا رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر بھی لوگ آ رہے تھے جا رہے تھے مگر وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

ظلِ سبحانی نے ایک گہری سانس لے کر دل ہی دل میں کہا۔ کہاں ہو تم؟ آ جاؤ۔ ذرا دیکھو تو میں بغیر چھڑی کے جانے کیسے جنون میں بہتا ہوا یہاں تک چلا آیا ہوں کوٹھی سے کم از کم دو میل کا فاصلہ میں نے پیدل طے کیا ہے۔ تمہارے لئے کیا ہے۔

رفیق ہانپ رہا تھا۔ وہ بھی چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ ایک ہاتھ درخت پر ٹیک کر کھڑا ہوا تھا۔ اپنی سانسیں درست کر رہا تھا۔ ظلِ سبحانی یہ دیکھ کر خوش ہو گیا کہ اس کا رقیب بھی اس کی طرح بوڑھا ہے بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی بوڑھا لگتا ہے۔ اس کے سر کے بال سفید ہو گئے تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اگرچہ وہ صحت مند تھا تاہم اس کے جبڑے سے اور اس کی حرکتوں سے بڑھاپا صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر ظلِ سبحانی کے پیچھے پارک کی طرف دیکھا۔ پھر کہا ”میں تھک گیا ہوں۔ وہاں ٹھنڈی



چھاؤں میں دم لوں گا۔“

ظلِ سبحانی نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ ”کیا رُبا تمہارے پاس آتی ہے؟“

”نہیں تقریباً چھ ماہ سے میں نے اسے نہیں دیکھا ہے۔“

”پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ گھر سے چلی گئی ہے؟“

رفیق سر جھکا کر تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ”میں تمہیں بتانا ضروری نہیں سمجھتا مگر بتا دوں گا۔ پارک میں چلو۔ کہیں آرام سے بیٹھیں گے۔“

وہ پیٹھ موڑ کر چل دیا۔ ظلِ سبحانی کے مزاج کے خلاف۔ تھا کہ اپنے رقیب کے پیچھے جائے مگر دل میں تجسس تھا کہ رقیب سے رُبا کا رابطہ کیسے قائم ہوتا ہے۔ اسے کیسے معلوم ہوا کہ پچھلی رات وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے؟

وہ مجبوراً اپنے رقیب کے پیچھے چلتا ہوا پارک میں داخل ہوا۔ دونوں تھوڑی دیر تک چلتے رہے۔ مناسب جگہ تلاش کرتے رہے۔ پھر ایک سایہ دار درخت کے نیچے ایک خالی بنچ پر بیٹھ گئے۔ ظلِ سبحانی نے پوچھا۔ ”ہاں اب بتاؤ؟“

رقیب نے اپنے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ لئے۔ پھر سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں پچھلی رات بہت دیر تک جاگتا رہا۔ ایسا ہمیشہ ہوتا ہے۔ میری بیوی مجھے طعنے دیتی رہتی ہے۔ میں ریٹائر ہو چکا ہوں۔ میرے پراویڈنٹ فنڈ سے تیس ہزار روپے ملے تھے۔ میرے جوان بیٹے نے اس سے ایک دکان کھول لی۔ اچھی آمدنی ہوتی ہے لیکن ہمیشہ یہی دکھڑا سننے میں آتا ہے کہ گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے‘ آمدنی کم ہے‘ اتنی آمدنی میں بہو نہیں آ سکے گی۔ میری بیوی کو بہو کا بڑا ارمان ہے۔ وہ کہتی ہے میں مر کیوں نہیں جاتا۔ میرا جنازہ نکلے گا تو بہو کی ڈولی آئے گی۔“

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ جیسے اندر دھواں بھر رہا ہو۔ پھر اس نے ایک طویل سانس چھوڑنے کے بعد کہا۔ ”مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے۔ اس مہنگائی سے لڑنے کے منصوبے بنائے جاتے ہیں اور جب ناکامی ہوتی ہے تو ہر رشتہ اپنے دل میں چپکے چپکے سوچتا ہے کہ گھر کا کوئی فرد کم ہو جائے۔“

اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”آہ! یہ ایک زہریلی سچائی ہے۔ گھر میں جگہ کم ہو تو بوڑھوں کو برآمدے یا اسٹور روم میں سونے کے لئے جگہ دیتے ہیں۔ کھانا کم ہو تو بوڑھے رشتوں کو کھرچن یا بچا کھچا دیا جاتا ہے۔ گھر میں افراد زیادہ ہوں تو پہلے

بوڑھوں کے مرنے کی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ جو سب سے پرانے' سب سے گہرے رشتے ہوتے ہیں' وہی اپنی قدر کھو دیتے ہیں' نئی محبتیں اور نئے رشتوں کا مان زیادہ ہوتا ہے۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا۔ میں کسی دن چلا جاؤں گا۔ پھر واپس نہیں آؤں گا مگر یاد رکھ۔ جب بہو آئے گی تو وہ تیرے گھر سے نکلنے کی دعائیں مانگے گی۔ تجھے طعنے دے گی تجھے کوسے گی کیونکہ بہو کو اپنے بچوں کے لئے جگہ کی ضرورت ہوگی' اس دنیا میں آنے والا ہر نیا انسان چاہتا ہے کہ پرانا انسان اس کے لئے جگہ چھوڑ دے۔"

ظلِ سبحانی نے کہا۔ "تمہارے ہاں ایسا ہوتا ہے۔ میرے بیٹے' میری بہوئیں' میری بیٹی' میرا پوتا' میری پوتی سب چاہتے ہیں کہ میرا اور رُبا کا سایہ ان کے سروں پر رہے۔ ہم ہمیشہ سلامت رہیں۔"

رفیق نے ایک قہقہہ لگایا' پھر کہا۔ "بڑی خوش فہمی میں مبتلا ہو جس گھر میں دولت کی افراط ہوتی ہے۔ وہاں تو بچے اور زیادہ خواہش کرتے ہیں اور منصوبے بناتے ہیں کہ کسی طرح بڑے میاں اور بڑی بی چل بسیں تاکہ دولت اور جائیداد ان کے درمیان جلدی تقسیم ہو جائے۔"

ظلِ سبحانی نے دل میں اس حقیقت کو تسلیم کیا۔ بیٹے بیٹی' پوتے' پوتی سبھی یہ چاہتے ہیں لیکن اس نے بظاہر انکار کرتے ہوئے فخر سے سینہ تان کر کہا۔ "تم بکواس کرتے ہو۔ ہم اعلیٰ خاندان کے لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں کمینگی نہیں ہوتی' بزرگوں کا احترام کیا جاتا ہے۔ میں بڑی دیر سے انتظار کر رہا ہوں کہ تمہاری تمہید ختم ہو اور تم مجھے رُبا کے متعلق بتاؤ کہ اس نے تمہیں گھر چھوڑنے کی اطلاع کیسے دی؟"

"میں وہی بتانے جا رہا تھا۔ میں پچھلی رات دیر تک جاگتا رہا' میری بیوی مجھے طعنے............"

ظلِ سبحانی نے جھنجلا کر بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تمہاری بیوی گئی جہنم میں۔ تم پھر وہی باتیں دہرا رہے ہو۔"

"میں وہی کہنے جا رہا ہوں کہ رُبا کا خط مجھے کیسے ملا۔"

ظلِ سبحانی نے چونک کر پوچھا۔ "کیا؟ کیا رُبا نے تمہیں بھی خط لکھا ہے؟"

"ہاں' وہی تو میں بتانے جا رہا ہوں۔"

"خدا کے لئے مجھ پر احسان کرو اور جلدی بتاؤ۔"



"میں کل رات دیر تک جاگتا رہا۔ اس لئے صبح دیر تک سوتا رہا۔ جب آٹھ بجے میں بازار سے سودا لانے کے لئے گھر سے نکلا تو گلی میں ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے ایک لفافہ مجھے دیا۔ میں نے پوچھا۔ یہ کیا ہے؟ اس نے دور گلی کے نکڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہاں ایک عورت تھی۔ اس نے مجھے ٹافیوں کا ایک پیکٹ دیا اور کہا کہ یہ خط آپ کو دے دوں' میں نے اس لفافے سے خط کو نکال کر دیکھا تو بہت ہی عمدہ خوشبو کا جھونکا آیا۔ اوپر ہی رُبا کا نام لکھا ہوا تھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ پھر دھک دھک کرتا چلا گیا۔"

ظلِ سبحانی نے کلمے کی انگلی تنبیہہ کے انداز میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اے! رُبا کی بات کرتے وقت رومانٹک ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سیدھی طرح بیان کرو۔"

اس نے بیان جاری رکھا۔ "میں نے وہ خط اس وقت نہیں پڑھا۔ فوراً ہی تیزی سے چلتا ہوا اس گلی کو پار کرتا ہوا نکڑ پر پہنچا وہاں رُبا نہیں تھی۔ میرا دل کہتا تھا کہ وہ کہیں قریب ہی چھپی ہوئی ہے' میں نے آس پاس کی تمام گلیاں دیکھ ڈالیں' میں کسی سے پوچھ نہیں سکتا تھا۔ بھلا کیا پوچھتا۔ لوگوں کو کیا جواب دیتا کہ کسے تلاش کر رہا ہوں اور اس عمر میں کس رشتے سے تلاش کر رہا ہوں؟"

"وہ خط کہاں ہے؟ مجھے دو۔ میں پڑھوں گا۔"

رفیق نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "وہ خط میرے نام آیا ہے۔ میں اپنا خط کسی کو پڑھنے نہیں دوں گا۔"

"لیکن وہ میری رُبا نے لکھا ہے۔"

"مگر مجھے لکھا ہے۔"

"تو چلو' خود ہی پڑھ کر سنا دو۔"

"ہاں' یہ کر سکتا ہوں۔"

اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس خط کو نکالا پھر اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ رُبا نے لکھا تھا۔

"رفیق!

آج میں رفیقِ رفتہ کو آواز دے رہی ہوں۔ آج مجھے بارہ سال کی رُبا یاد آ رہی

ہے۔ تم بارہ سال سے میری عمر کے سترہ سال تک میرے ساتھی' میرے پڑوسی رہے'
تمہارے ساتھ میں نے بڑا ہی معصوم اور بڑا ہی پیارا وقت گزارا ہے۔ سوچتی ہوں
اس دور میں محبت کتنی سیدھی سادی اور پہاڑی چشمے کے پانی کی طرح صاف وشفاف
ہوتی تھی۔ کوئی میل نہیں ہوتا تھا۔

تم نے میری تمنا کی اور میں نے ظلّے کو اپنالیا۔ سچ کہتی ہوں تمہاری تمنا جو میرے
لئے تھی مجھے بہت اچھی لگی' آج بھی اچھی لگتی ہے۔ میں نے تقریباً چالیس یا پینتالیس
برس سے تمہاری اس تمنا کو اپنے سینے کے اندر ایک دھڑکتی ہوئی ننھی سی ڈبیہ میں بند
کررکھا ہے۔ کبھی کبھی میں اس ڈبیہ میں جھانک کر دیکھتی ہوں اور فتح مندی کے احساس
سے سرشار ہو جاتی ہوں۔

یہ ہر عورت کی نفسیاتی سچائی ہے۔ جو انکار کرتی ہے وہ جھوٹی ہے یا پھر وہ کبھی
ساون کے جھولے میں نہیں بیٹھی' کبھی اس کے آسمان پر محبت کے بادل نہیں چھائے۔
اس کی جوانی کے دیس میں کسی پی کا سندیس نہیں آیا۔ ایسی عورت' عورت نہیں
ہوتی۔ ایک آسیب زدہ مکان ہوتی ہے جس کے اندر حسین یادوں کا دم نکلتا رہتا ہے۔

رفیق' پچھلی بار جب تم سے ملاقات ہوئی تو تم نے اپنا دکھڑا سنایا۔ تم اپنے جوان
بیٹے پر بوجھ بن گئے ہو۔ مہنگائی نے تمہیں بیوی اور بیٹے کی نظروں میں سستا کردیا ہے۔
اگر حالات نے یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہا کہ تمہارے گھر میں کسی فرد کو مرجانا چاہئے یا کم
ہوجانا چاہئے تو تمہارا نام سرفہرست ہوگا اور تم نے یہ بھی بتایا کہ بیزار ہو کر گھر چھوڑ
دینا چاہتے ہو' کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتے۔

تو پھر آؤ' گھر سے باہر نکلو۔ میں نے بھی اپنا گھر چھوڑ دیا ہے۔ یہ ہمارا آخری موسم
ہے۔ ہم فیصلہ کریں گے کہ انسانوں کو اپنے آخری موسم میں کس طرح زندہ رہنا
چاہئے۔ میں تمہیں زندہ رہنے کے لئے جگہ کا پتہ بتا رہی ہوں' وہ پتہ اس خط میں لکھا
ہوا ہے۔ تم وہاں جاؤ۔ وہاں تمہاری رہائش کا انتظام ہو جائے گا شرط یہ ہے کہ اس عمر
میں بھی اپنی صلاحیتوں اور اپنی توانائیوں کی حد تک تھوڑی بہت محنت کرو۔ جس قدر
بھی کام کرسکتے ہو' کرو اور اپنی صلاحیتوں سے' اپنی قوت ارادی سے یہ ثابت کردو کہ
بوڑھے بالکل ریٹائر نہیں ہو جاتے۔ تین چیزیں انہیں ناقص بناتی ہیں' جسمانی کمزوری'
بیماریوں کے حملے اور بدترین گھریلو حالات۔



کوئی بھی ماہر نفسیات بتائے گا کہ بڑھاپے میں بیماریوں کا علاج تو ہے لیکن
بوڑھوں کو دوائیں اس لئے اثر نہیں کرتی ہیں کہ انہیں اپنے رشتوں کی محبت اور توجہ
نہیں ملتی۔ وہ غیر شعوری طور پر احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔ اگر علم الاجسام کے
ماہرین سے پوچھا جائے تو وہ بتائیں گے کہ جسمانی کمزوری صرف بوڑھوں سے ہی
منسوب نہیں ہے۔ جوانی میں بھی بے شمار نوجوان طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہوتے
ہیں' جوانی میں ہڈیوں کے ڈھانچے نظر آتے ہیں اور کج روی کے باعث دونوں ہاتھوں
سے کمر پکڑ کر بوڑھوں کی طرح چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اب رہ گئے گھریلو حالات تو
جب سے انسانی تہذیب بنتی سنورتی چلی آئی ہے اس وقت سے اب تک کسی نے یہ
نہیں سوچا کہ بوڑھوں کو اپنے گھر میں پناہ نہ ملے تو وہ جیتے جی کہاں جائیں؟

ہم سوچیں گے۔ ہم بوڑھوں کے لئے پناہ گاہیں بنائیں گے۔ انہیں محرومیوں اور
مایوسیوں سے بچائیں گے۔ بے توجہی اور احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہونے دیں گے تم
اس پتے پر جاؤ اور اس آخری موسم کو ہنستے بولتے گزار دو۔ فقط

تمہیں یاد رکھنے والی' رُبابہ خاتون۔"

خط کی تحریر ختم ہوگئی۔ ظلِ سبحانی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "خدا کا
شکر ہے' میں سمجھ رہا تھا یہ کوئی عشقیہ خط ہوگا۔ مجھے اپنی رُبا پر ناز ہے کہ اس نے انسانی
ہمدردی کے تحت تمہیں یہ خط لکھا ہے۔ تمہیں جو پتہ بتایا ہے وہاں جاؤ تم میری کوٹھی
میں کیوں آئے تھے؟"

"میں رُبا سے ملنے آیا تھا۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ گھر سے کیوں جارہی ہے یا
کیوں چلی گئی ہے؟ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ وہ میرا کوئی ٹھکانہ بنائے میں وہاں آرام
سے رہوں اور وہ خود کہیں بھٹکتی رہے' نہیں' میں پہلے اسے تلاش کروں گا۔"

"اسے تلاش کرنے کا فرض میرا ہے' میں اس کا شوہر اور ہمدرد ہوں۔"

"میں اس کے شوہر سے پہلے کا پڑوسی ہوں۔ اس کا وہ چاہنے والا ہوں جس کی
تمنا کو اس نے اب تک دل میں چھپا رکھا ہے۔"

"تم بہت ہی گرے ہوئے خیال کے آدمی ہو تم احسان فراموش ہو۔ رُبا نے
تمہیں ایک اچھی جگہ پہنچانے کے لئے اپنی ایک انگلی پکڑنے کے لئے دی اور تم اس کا
پہنچا پکڑنا چاہتے ہو۔"

"تم کچھ بھی کہہ لو۔ میں ایمان سے کہتا ہوں۔ میری نیت میں کھوٹ نہیں ہے' مجھے تمہاری بیوی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ دیکھو' حساب کرو۔ جب زُبا اٹھارہ برس کی تھی تو تم سے شادی ہوئی تھی یعنی اٹھارہ برس کی عمر کے بعد وہ تمہاری ہوئی اب اس پر تمہارے سوا کسی کا حق نہیں ہو سکتا لیکن اٹھارہ برس کی عمر سے پہلے جس زُبا کو میں جانتا ہوں میں اس کی محبت کے گن گا رہا ہوں اس کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ تم اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہو؟"

ظلِ سبحانی نے چڑ کر پوچھا۔ "کہاں ہے وہ اٹھارہ برس سے پہلے والی زُبا؟ کیا اس کا کوئی وجود ہے؟"

"بے شک اس کا وجود ہے۔ جب سے میں نے اس کا یہ خط پایا ہے اسے دوبار اپنے سامنے دیکھ چکا ہوں۔ وہ دیکھو' وہ دیکھو۔ پھر نظر آ رہی ہے' یہ تیسری بار نظر آ رہی ہے۔ بالکل وہی سترہ برس کی دوشیزہ۔ وہی شوخی' وہی مسکراہٹ۔ ہائے کیا حسن ہے۔ کیا سادگی ہے۔ سیدھی دل میں اتر رہی ہے۔"

رفیق سامنے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا جا رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔ ظلِ سبحانی نے اپنی آنکھیں مل مل کر اُدھر دیکھا۔ اسے بھی وہ نظر آئی اور ایسے آئی جیسے بڑھاپے میں مستی آتی ہے اور خیالوں میں حسن پرستی آتی ہے۔ آدمی کا جسم پرانا ہو جائے تو وہ بوڑھا ہو جاتا ہے۔ یادیں پرانی ہوں تو وہ جوان ہو جاتی ہیں' اس وقت زُبا آئی تو گویا یادوں کو جوانی آ گئی۔

رفیق نے ذرا کسمساتے ہوئے' بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "یہ اچھا موقع ہے۔ میں ثابت کروں گا کہ میں مرد ہوں' مجھے بھی غصہ کرنا اور ڈانٹنا آتا ہے۔"

ظلِ سبحانی نے کہا۔ "خبردار! میں نے اسے پھول کی طرح رکھا ہے۔ تم اسے آنکھ بھی نہیں دکھا سکتے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی رفیق ایک دم سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ زُبا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟ کیا میں برف کا تودہ ہوں؟ کیا مجھ میں حرارت نہیں ہے؟ میں وہ نادان رفیق ہوں جو تمہاری ہر سختی کو' بدتمیزی کو ہنس کر ٹال دیا کرتا تھا۔ یہ کیا نادانی ہے کہ بڑھاپے میں تم موسموں کا عذاب سہنے کے لئے گھر سے



نکل گئی ہو۔ کہاں بھٹک رہی ہو' کیوں بھٹک رہی ہو؟"

زُبا نے ہنستے ہوئے شوخی سے پوچھا۔ "کیا میں۔ تمہیں بوڑھی نظر آ رہی ہوں' کیا بڑھاپے میں گھر سے نکلی ہوں۔ تمہاری بینائی اس قدر کمزور ہو گئی ہے کہ تمہیں سترہ برس کی زُبا نظر نہیں آ رہی ہے' ہائے یہی تو گھر سے بھاگنے اور اپنے پیچھے بھگانے کی عمر ہے۔"

ظلِ سبحانی نے کہا۔ "زُبا! یہ آنکھوں والا اندھا ہے جوانی کو دیکھتا ہے اور بڑھاپے کو سوچتا ہے۔ میں تمہارا نقطۂ نظر سمجھ گیا ہوں۔ بڑھاپے میں جوانی کو سوچنا چاہئے۔ اس سے توانائی پیدا ہوتی ہے۔ بیماریوں سے اور اپنے حالات سے نمٹنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔"

رفیق نے کہا۔ "مجھ سے غلطی ہوئی۔ اس زُبا کو جو بوڑھی ہے اور گھر سے نکل گئی ہے۔ اسے ڈانٹنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔ وہ اس کی بیوی ہے اور یہ اس سے نمٹ لے گا۔ میں تمہیں ڈانٹنے کا حق رکھتا ہوں۔ بتاؤ' اس عمر میں گھر سے اکیلی کیوں نکلی ہو؟ نکلنے سے پہلے مجھے آواز کیوں نہ دی؟ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ میں غصے کا بہت خراب ہوں' اگر تم خیریت چاہتی ہو تو فوراً واپس چلی جاؤ۔"

وہ سہم گئی مگر اپنی ضدی ادائیں دکھاتے ہوئے بولی۔ "میں نہیں جاؤں گی۔"

رفیق نے ایک قدم آگے بڑھا کر کہا۔ "اگر نہیں جاؤ گی تو میں تمہاری پٹائی کروں گا۔ میں اور طرح کا مرد ہوں۔"

وہ ایک دم سے سہم گئی' پیچھے ہٹتے ہوئے ایک جھاڑی کے پیچھے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ظلِ سبحانی نے تڑپ کر کہا۔ "یہ تم نے کیا کیا؟ تم نے اسے ناراض کر دیا ہے۔"

"وہ میری تھی۔ میں نے اسے ناراض کیا' مجھے خوشی ہے کہ اس نے میری بات مان لی اور گھر واپس چلی گئی۔"

"احمق! سترہ برس والی زُبا کا گھر کہاں ہے؟ یہ تو اب سے بیالیس پینتالیس برس پہلے کی بات ہے۔ جہاں رہتی تھی وہاں کا محلہ بھی بدل گیا ہے' بڑی بڑی کوٹھیاں بن گئی ہیں اس کا گھر کہاں ہے؟"

تب رفیق کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اس نے کہا۔ "اوہ میں تو بھول ہی گیا تھا۔

میں نے یہ نہیں پوچھا کہ آج کل وہ کہاں رہتی ہے' ابھی پوچھوں گا۔"

وہ آگے بڑھ گیا۔ ظلِ سبحانی تیزی سے اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "اگر وہ کہیں چلی جائے گی تو میں تمہارے ساتھ بری طرح پیش آؤں گا۔"

وہ دونوں ہانپتے ہوئے جھاڑی کے دوسری طرف پہنچے۔ پھر ٹھٹک گئے۔ وہاں گھاس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی پشت نظر آ رہی تھی۔ سر پر اتنی بڑی ریشمی چادر تھی کہ ان دونوں کے زاویۂ نظر سے بالکل چھپ گئی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ پھر ظلِ سبحانی نے ذرا تھوک نگل کر ہولے سے آواز دی۔ "رُبا!"

آواز سنتے ہی وہ چادر کے سائے میں سمٹنے لگی۔ ذرا دیر خاموش رہی۔ پھر ان دونوں نے محسوس کیا کہ وہ رو رہی ہے کیونکہ ہچکیوں کی تال پر اس کا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ وہ دونوں اس کے پیچھے آ کر بیٹھ گئے۔ رفیق نے بڑی محبت سے پوچھا۔ "تمہیں کیا ہوا ہے کیوں رو رہی ہو؟"

اس کی مترنم آواز سنائی دی۔ "اپنی بدنصیبی پر رو رہی ہوں' میں نے بوڑھے والدین کی بدنامی کا خیال نہیں کیا۔ گھر سے بھاگ کر آ گئی لیکن..........."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ظل سبحانی نے کہا۔ "ہاں' ہاں۔ اب بھی مجھے یاد ہے' شادی سے پہلے تم گھر سے بھاگ گئی تھیں۔ کل رات بھی مجھے چھوڑ کر یہاں چلی آئیں۔ مگر دیکھو' میری چاہت کا حساب کرو۔ میں تمہیں تلاش کرتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی رُبا کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ اچانک ہی بھڑک گئی' ذرا دور ہو گئی' پھر پلٹ کر بولی۔ "تمہیں شرم نہیں آتی تم دونوں بڈھے آئینہ دیکھو۔ میں تمہاری بیٹی اور پوتی کے برابر ہوں۔"

وہ دونوں ہکا بکا سے ہو کر اسے دیکھ رہے تھے ان کے سامنے ایک نہایت ہی نوخیز لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ وہ روتے روتے کہہ رہی تھی۔ "میں اپنے نواز کے ساتھ بھاگ کر آئی ہوں۔ وہ یہاں مجھے بٹھا کر گیا ہے۔ کہہ رہا تھا۔ سامنے والے محلے میں رہنے کا ٹھکانہ کرے گا۔ دو گھنٹے ہو گئے۔ ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔ یا خدا' میں کیا کروں۔ اسے کہاں ڈھونڈنے جاؤں۔



اکیلی ہوں جوان تو جوان' بڈھے بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔"

رفیق نے کہا۔ "تم ہمیں غلط سمجھ رہی ہو۔ ہم تمہارا پیچھا نہیں کر رہے ہیں۔"

"پھر کیا اپنی بیٹی کا پیچھا کر رہے ہو۔ کس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا تھا؟ کیا سمجھ کر رکھا تھا؟"

اتنے میں دور سے آواز سنائی دی۔ "اوے ریشماں' کیا بات ہے؟ یہ بڈھے کون ہیں؟"

یقیناً وہ نواز تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی' وہ تیزی سے اس کی طرف لپکی' کہنے لگی۔ "یہ بڈھے شیطان ہیں مجھے تنہا دیکھ کر چھیڑنے آ گئے ہیں۔"

نواز پارک کے پچھلے حصے کی ریلنگ پھلانگ کر آ رہا تھا۔ ریشماں کی باتیں سن کر طیش میں آ گیا پھر تیزی سے دوڑتا ہوا ان کے قریب پہنچ کر انہیں سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "اوئے شرم کرو۔ اپنی عمر کا خیال کرو۔ میں تم لوگوں پر ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکتا۔ میرے باپ دادا کے برابر ہو۔"

ظلِ سبحانی نے کہا۔ "ہمیں غلط نہ سمجھو ہم اپنی رُبا سمجھ کر تمہاری ریشماں کے قریب آئے۔ یہ چادر میں چھپی تھی۔ ہم اسے دیکھ نہ سکے جب دیکھ لیا تو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔"

نواز نے ان دونوں کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ رُبا کون ہے؟ تمہاری کیا لگتی ہے۔؟"

"وہی لگتی ہے جو ریشماں تمہاری لگتی ہے۔"

"مجھے نادان بچہ نہ سمجھو میں عین وقت پر پہنچ گیا ہوں تو باتیں بنا رہے ہو۔ کیا بڑھاپے میں ہوس بڑھ جاتی ہے؟"

ظلِ سبحانی نے انکار میں سرہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں بیٹے! ہر بوڑھا شیطان نہیں ہوتا۔ ہوس پرست نہیں ہوتا۔ وہ اپنی بچھڑی ہوئی محبت کے پیچھے بھٹکتا ہے۔ ماضی کی یادیں اسے گمراہ کرتی ہیں' جن بوڑھوں کو اپنی رُبا کی جوانی یاد نہیں آتی وہ دوسری جوان عورتوں میں اسے تلاش کرتے ہیں اور بڑھاپے میں بدنام ہوتے ہیں۔ ورنہ ایک موٹی سی عقل کی بات تو تمہاری سمجھ میں بھی آ جائے گی۔ وہ یہ کہ محبت جوانی میں گمراہ ہوتی ہے۔ جوانی میں محبت پر گناہ کا الزام لگتا ہے۔ بوڑھوں میں حوصلہ نہیں

ہوتا۔ صرف عمرِ رفتہ کو آواز دینے کا مشغلہ ہوتا ہے۔ تم میں، ہم میں بڑا واضح فرق ہے۔ تم سمندر میں اتر جاتے ہو۔ تہہ تک پہنچ کر سیپیاں لے آتے ہو، ہم سمندر کے کنارے لہریں گنتے گنتے اپنی عمر تمام کردیتے ہیں۔"

ظلِ سبحانی وہاں سے پلٹ کر جانے لگا۔ رفیق بھی اس کے ساتھ ہوگیا۔ نواز نے کہا۔ "خوب باتیں بنا کر جارہے ہو، میں نے تو اسّی، نوے برس کے بوڑھوں کو سولہ برس کی لڑکیوں سے شادی کرتے دیکھا ہے۔"

رفیق نے پلٹ کر کہا۔ "اور ہم نے سولہ سترہ برس کے لڑکوں کو چالیس برس کی عورتوں سے شادی کرتے دیکھا ہے۔ اگر کچھ بوڑھے اور کچھ جوان ایسی الٹی سیدھی حرکتیں کرتے ہیں تو تمام بوڑھوں پر یا تمام جوانوں پر یہ الزام عائد نہیں کرنا چاہئے۔"

ظلِ سبحانی نے ذرا دور کھڑی ہوئی ریشماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جب رُبا اس عمر میں گھر سے بھاگ گئی تھی تو میں نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ پھر اسے سمجھا منا کر اس کے گھر واپس لے گیا تھا۔ میں نے شادی کا پیغام دیا تھا۔ ہم میاں بیوی راضی تھے اس لئے کوئی انکار نہ کرسکا۔ تم اور ریشماں بھی آپس میں راضی ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اب ریشماں کے والدین انکار نہیں کریں گے۔ عزت، آبرو سے بیاہ کر تمہارے ساتھ رخصت کردیں گے۔ میرا نیک مشورہ ہے۔ اس پر عمل کرو۔"

ریشماں نے یہ باتیں سن کر اپنے آپ کو چادر میں چھپالیا تھا۔ چونکہ چھپ گئی تھی اس لئے پھر رُبا لگ رہی تھی۔ ظلِ سبحانی نے ایک سرد آہ بھری۔ "ہائے دلرُبا! ہر پردے کے پیچھے تیرا گمان کیوں ہوتا ہے؟"

وہ دونوں سر جھکا کر پارک سے باہر آگئے۔ باہر سڑک پر وہی چہل پہل تھی۔ زندگی کے ہنگامے جوان تھے۔ رفیق نے کہا۔ "میں یقین سے سوچ رہا ہوں کہ رُبا اپنی کسی سہیلی کے ہاں گئی ہے اور وہیں پناہ لی ہے۔ کیا تمہیں اس کی سہیلیوں کے نام اور پتے معلوم ہیں؟"

ظلِ سبحانی نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر کوئی جواب دیئے بغیر آگے بڑھ کر ایک قریبی ٹیلی فون بوتھ کے اندر گھس گیا۔ رفیق اس کے پیچھے بوتھ میں داخل ہوگیا۔ ظلِ سبحانی نے فون کے ذریعے اپنے گھر والوں سے رابطہ قائم کرتے ہوئے کہا۔ "تم تو جونک کی طرح چمٹ گئے ہو۔ پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔"



"مجھے اس کا پتہ معلوم ہوجائے گا اور یہ اطمینان ہوجائے گا کہ وہ بخیریت ہے تو میں اس کے بتائے ہوئے پتے پر چلا جاؤں گا۔"

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ اس سے ملنے کا بہانہ ڈھونڈ رہے ہو۔"

رابطہ قائم ہوگیا۔ دوسری طرف سے بانو بے مثال کی آواز سنائی دی۔ ظلِ سبحانی نے کہا۔ "بانو! میں ایک کم بخت سے باتیں کرتا ہوا یہاں گرین پارک تک آگیا ہوں۔ میرے لئے کار بھجوا دو یہ بتاؤ، صابری نے تمہاری امّی کو ڈھونڈ نکالنے کے لئے اب تک کیا کیا ہے؟"

"ابا جان! وہ بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے ہیں، اپنے آدمیوں سے کہہ دیا ہے کہ اس شہر کے تمام چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں جاکر دریافت کریں۔ شاید امّی نے کسی ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لیا ہو۔ میں ان کی سہیلیوں کے ہاں فون کررہی ہوں۔"

"بیٹے! تمہاری امّی نے جس گھر میں بھی پناہ لی ہوگی۔ وہاں کے لوگوں کو سمجھا دیا ہوگا کہ ان کی طرف سے لاعلمی ظاہر کریں۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے فون کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تم خود گھر سے نکلو اور ہر اس عورت کے دروازے پر جاؤ جس سے تمہاری امّی کی تھوڑی سی بھی واقفیت ہے۔ صابری اس وقت کہاں ہوگا؟"

پتہ نہیں آپ کے گھر سے نکلنے کے بعد وہ بھی چلے گئے تھے۔"

دوسرے ہی لمحے بانو کا مسرور لہجہ سنائی دیا۔ "اوہ، ابا جان ان کی عمر بہت لمبی ہے، ذکر کرتے ہی آپہنچے۔ کیا آپ ان سے بات کریں گے؟"

"ہاں، اسے ریسیور دو۔"

چند لمحے بعد انسپکٹر صابری کی آواز سنائی دی۔ "انکل! میں نے اس شہر کے تمام تھانوں میں اطلاع دے دی ہے کہ آنٹی ایک لاکھ روپے اور بہت سارے زیورات لے کر گھر سے نکلی ہیں، میں نے تمام تھانوں کے آفیسر انچارج سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنے اپنے علاقے کے ہوٹلوں میں جاکر معلومات حاصل کریں۔ اس سلسلے میں، میں نے باقاعدہ رپورٹ درج نہیں کرائی ہے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔ اب ایک کام اور کرو۔ بانو جانتی ہے کہ اس کی امّی کی رقم کون کون سے بینک میں ہے، تم ان بینکوں کے منیجروں سے ملاقات کرو اور انہیں سمجھاؤ کہ رُبا خاتون کا چیک لے کر جو بھی آئے اسے بنک میں روک کر ہمیں اطلاع دی

جائے۔ شاید اسی طرح ہم تمہاری آنٹی کا پتہ معلوم کر سکیں۔"

"انکل! کیا اخبار کے اطلاعی کالموں میں آنٹی کو مخاطب کیا جائے اور ان سے گھر واپس آنے کی التجا کی جائے؟"

"ابھی نہیں، ہم کل تک رُبابہ کی واپسی کا انتظار کریں گے۔ اس کے بعد ایسے اقدامات کئے جائیں گے۔"

انسپکٹر زبیری نے پوچھا۔ "گھر میں آنٹی کی کوئی تصویر کیوں نہیں ہے؟ اس وقت تصویر کی سخت ضرورت ہے۔"

"تصویریں تو یقیناً ہونی چاہئیں۔ میرا خیال ہے کہ رُبابہ اپنی تمام تصویریں اور نیگیٹو ساتھ لے گئی ہے۔ تمہارے گھر میں تو ایک آدھ تصویر ہونی چاہئے۔"

"میرے البم میں آنٹی کی جو تصویر ہے وہ اب سے پچیس برس پہلے کی ہے جب بانو بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس تصویر سے آج کی آنٹی پہچانی نہیں جائیں گی۔"

"اس عورت نے بڑی مشکلات پیدا کر دی ہیں، ایسی عمر میں آرام اور سکون سے گھر کی چار دیواری میں رہنا چاہئے وہ اپنے ساتھ سب کو دوڑا رہی ہے۔ بہرحال میں گھر آؤں گا تو پھر بات کروں گا۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ سر گھما کر دیکھا تو یاد آیا کہ رفیق پاس کھڑا ہوا ہے۔ اس نے گھور کر پوچھا۔ "کب تک سائے کی طرح لگے رہو گے۔ ہماری گھریلو باتیں کیوں سن رہے ہو؟"

رفیق بوتھ سے باہر آگیا۔ پھر بولا۔ "میں ایک بات کتنی بار دہراؤں، کہہ جو دیا ہے رُبا کو بخیریت دیکھ لوں گا تو چلا جاؤں گا۔"

وہ دونوں چلتے ہوئے پھر پارک کے سامنے آکر ایک درخت کے سائے میں کھڑے ہو گئے۔ ظلِ سبحانی نے کہا۔ "ابھی میری کار آرہی ہے۔ میں تمہیں رُبا کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا دوں گا۔ جب وہ مل جائے گی تو تمہیں خوش خبری سنا دوں گا۔"

رفیق نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "آج تک دنیا کے کسی شخص نے اپنے رقیب کو کبھی کوئی خوشخبری نہیں سنائی۔"

ظلِ سبحانی سڑک کے دوسری طرف دور دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ کوئی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا اور کہیں دیوانہ وار ایک طرف تک رہا ہو تو وہ



یقیناً بچھڑے ہوئے رشتوں کو یا بچھڑی ہوئی یادوں کی تصویروں کو دیکھتا ہے۔

ظلِ سبحانی کو حمیرا نظر آرہی تھی۔ وہ بھی اٹھارہ یا بیس برس کی دوشیزہ تھی۔ خوب صورت تھی۔ دل نشین تھی اسے دیکھ کر اپنا لینے کو جی چاہتا تھا۔ وہ سڑک کے اس پار کھڑی ہوئی تھی، جیسے دریا کے دوسرے کنارے پر ہو لیکن اس کی آواز صاف طور سے سنائی دے رہی تھی۔ "ظلے! کیا مجھے بالکل ہی بھول گئے؟ یاد کرو۔ پہلے تو میں ہی تمہاری سب کچھ تھی۔ تم میری گلی کے چکر لگایا کرتے تھے۔"

رفیق نے پوچھا۔ "تم ادھر کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا سڑک کے پار کوئی ہے؟"

ظلِ سبحانی ایک دم سے چونک گیا۔ پھر رفیق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "وہ ادھر سڑک کے دوسری طرف جو علاقہ ہے اب سے چالیس پینتالیس برس پہلے ایسا نہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے کچے پکے مکانات تھے۔ کچی گلیاں تھیں۔ تعجب ہے میں اتنی دیر سے یہاں ہوں اور اس علاقے کو بالکل انجانی بستی سمجھ رہا ہوں۔"

رفیق نے کہا۔ "شاید اس لئے کہ اب وہ علاقہ نہیں رہا۔ دیکھو کتنی بڑی بڑی بلڈنگیں اور مکانات بن گئے ہیں۔ کیسی رونق ہے ادھر۔ لگتا ہے وہاں کی ہر گلی جوان ہوگئی ہے۔ ہم بوڑھے وہاں جائیں گے تو شاید پچھلی گلیوں کو اور راستوں کو نہ پہچان سکیں۔"

ظلِ سبحانی نے کہا۔ "علاقے بدل جاتے ہیں لیکن زمین وہی رہتی ہے۔ سڑکوں اور گلیوں کے نام بھی وہی رہتے ہیں۔ ہم ناموں سے پہچان لیں گے۔"

سڑک کے اس پار حمیرا پھر نظر آنے لگی۔ وہ بالکل ایسی ہی تھی جیسے آج سے سالہا سال پہلے آخری بار دیکھا تھا۔ اس نے کہا۔ "زمانہ بدل جاتا ہے لیکن وہ آئینہ نہیں بدلتا جس میں جھانک کر ہم ماضی کا چہرہ دیکھتے ہیں۔ بے شک اس کا من مزاج بدل گیا ہو گا لیکن نام تو حمیرا ہی ہو گا۔"

"حمیرا؟" رفیق نے اس کا منہ تکتے ہوئے پوچھا۔ "یہ حمیرا کون ہے؟"

"وہ، وہ دیکھو۔ سڑک کے اس پار کھڑی ہوئی ہے، پہلے میں اس کے پیچھے بھاگتا رہتا تھا۔"

رفیق نے ادھر دیکھا لیکن اسے کوئی ایسی لڑکی نظر نہیں آئی۔ سب چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اس نے پوچھا۔ "ان گزرنے والی عورتوں

میں حمیرا کون ہے؟"

"وہ عورت نہیں' لڑکی ہے۔ ٹھیک میرے سامنے فٹ پاتھ پر سڑک کے دوسری طرف کھڑی ہوئی ہے۔"

رفیق نے انکار میں سرہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو نظر نہیں آرہی ہے۔"

"ہر محبوبہ' محبت کی آنکھ سے دکھائی دیتی ہے۔"

رفیق نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "سچ کہتے ہو میں محبت کی آنکھ سے دیکھتا ہوں تو مجھے رُبا نظر آتی ہے۔ دیکھو ناراض نہ ہونا۔ میں تمہاری بیگم رُبابہ خاتون کے متعلق نہیں کہہ رہا ہوں۔"

ظلِ سبحانی سڑک کے پار دیکھ رہا تھا اور خوابیدہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "میں ہر روز اس کی گلی کا چکر لگایا کرتا تھا۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ اس سامنے والے راستے پر اب بھی میں جاؤں تو چند قدم کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی مسجد دکھائی دے گی لیکن نہیں' شاید وقت کے ساتھ ساتھ اس مسجد کا نقشہ بھی بدل گیا ہے۔ وہ کافی پھیل گئی ہے اور اس کا ایک بلند مینار یہاں سے بھی نظر آرہا ہے۔ ٹھیک اس کے پیچھے ایک گلی ہے' اس گلی کو پار کرنے کے بعد بائیں طرف مڑنا ہوتا ہے۔ پھر دائیں طرف ایک گلی ہے' اسی گلی کے پانچویں مکان میں وہ رہتی تھی' شاید اب بھی رہتی ہے۔"

"کیا وہ آج بھی تمہیں نظر آتی ہے؟"

"ہاں' میں اسے دیکھ رہا ہوں۔"

"پھر تم نے اسے چھوڑ کر رُبا کا ہاتھ کیوں پکڑ لیا؟ کیوں اسے مجھ سے چھین لیا؟"

ظلِ سبحانی نے ایک ہاتھ سے اپنے سینے کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "جتنی بھی محبتیں ملتی رہیں' یہ سینہ خالی رہتا ہے۔ ہم خوب سے خوب تر کو حاصل کرنے کے لئے ایک سے دوسرے کی طرف لڑھک جاتے ہیں۔ ہوا یوں کہ میں ایک دن اسی راستے سے حمیرا کے پاس جا رہا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو دور ہی دور سے دیکھتے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ میں صبح اور شام کو کسی وقت اس گلی میں آتا ہوں۔ میں اس گلی کے سامنے والی پان کی دکان کے پاس کھڑے ہو کر کبھی پان چباتا تھا کبھی سگریٹ کے کش لگاتا تھا' اس کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ یہ ہماری نادانی اور عاشقی کا زمانہ تھا۔ میں بہت معزز تھا۔ برٹش سرکار نے میرے والد کو خان بہادر کا خطاب دیا تھا۔ جو لوگ اس زمانے میں خان بہادر



ہوا کرتے تھے انہیں سرکار کی طرف سے بندوق یا پستول رکھنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ میں دکھاوے کے لئے اور دوسروں پر رعب ڈالنے کے لئے کبھی کبھی اپنے والد کا پستول لے کر چپ چاپ نکل جاتا تھا۔ خاص طور پر اپنی محبوبہ کی گلی کے پاس آکر پان چباتے وقت یا سگریٹ کا کش لگاتے وقت کسی نہ کسی طرح اپنے پستول کی نمائش کرتا تھا۔ وہاں کے لوگ مجھ سے متاثر ہوتے تھے۔ میرا رعب اور دبدبہ اتنا تھا کہ ہماری عاشقی کا بھید کھلنے کے باوجود کوئی میری مخالفت میں بولنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔"

رفیق نے کہا۔ "پھر تو تم پستول دکھا کر حمیرا کو زبردستی اپنے گھر لا سکتے تھے۔"

"ہاں' لا سکتا تھا مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اس روز جب میں اس گلی میں پہنچا تو یہاں سے وہاں تک سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں اور دکانوں تک محدود تھے۔ سڑک پر آنے کی کوئی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ پان کی دکان کے پاس جبرو دادا نے ایک لڑکی کی کلائی پکڑ لی تھی۔ اس لڑکی کی پشت میری طرف تھی۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس کی آواز سن رہا تھا۔ وہ جبرو دادا کو گالیاں دے رہی تھی اور آس پاس کے لوگوں کو بھی گالیاں سنا رہی تھی کہ لوگ بزدل ہیں' ایک بدمعاش سے کسی شریف لڑکی کا ہاتھ نہیں چھڑا سکتے۔

اس پورے علاقے میں جبرو دادا کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی' اس کا نام جبار خان تھا لیکن نام بگڑ کر جبرو دادا بن گیا تھا۔ کوئی بڑی واردات ہو جائے تو تھانے والے اسے لے جا کر حوالات میں بند کر دیتے تھے پھر دوسرے دن چھوڑ دیتے تھے۔ اس علاقے کے اچھے اچھے جوان بھی اس سے کترا کر نکل جاتے تھے۔ شریف اور عزت دار لوگ اس کے منہ نہیں لگتے تھے۔ میں نے فوراً ہی پستول نکال کر اسے للکارتے ہوئے کہا۔ "جبرو اس کا ہاتھ چھوڑ دے۔"

میری للکار سنتے ہی اس دوشیزہ نے پلٹ کر دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے خوش نصیبی نے پلٹ کر دیکھا ہو اور یہ درست ہے۔ خوش نصیبی ہمیشہ خوش نصیبی کے چنگل میں پھنسی رہتی ہے۔ اس سے پنجہ لڑا کر' اپنی خوش نصیبی کی کلائی چھڑا کر اپنے ساتھ لے جانے والا ہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ جبرو دادا نے غصے سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے بارے میں بہت سن چکا ہوں۔ خان بہادر کے لڑکے ہو۔ پستول لے کر گھومتے ہو مگر میں ان گیدڑ بھبکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ اپنی زندگی چاہتے ہو تو یہاں سے چلے

چلے جاؤ۔ آئندہ میرے علاقے میں کبھی نہ آنا۔"

میں نے کہا۔ "میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔ اس کی کلائی چھوڑ دو۔"

اس نے بائیں ہاتھ سے اس کی گوری کلائی کو تھام رکھا تھا۔ اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر للکارنے کے انداز میں بولا۔ "اگر ہمت ہے تو چھڑا لو۔ اتنا میں بھی جانتا ہوں کہ ایک ایک گولی کا حساب انگریز سرکار کو دینا پڑتا ہے۔ یہ پستول خان بہادر کے نام پر ہے تم اسے استعمال نہیں کر سکتے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی میں نے ٹھائیں سے گولی چلائی۔ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ ایک دم سے نیچے آگیا۔ میرا نشانہ سچا تھا۔ اِدھر گولی اس کی کلائی کے آر پار ہوئی اُدھر دوشیزہ کی کلائی آزاد ہوگئی۔ وہ ایک دم سے دوڑتے ہوئے میرے قریب آگئی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ زُبا تھی۔ ایسی گوری، گلابی کہ جبرو نے کلائی کے جس حصے کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا وہ حصہ بالکل سرخ ہوگیا تھا جیسے ابھی لہو اچھل پڑے گا۔ بدن کی رنگت اور نزاکت ہو تو ایسی ہی جہاں مرد کا سایہ پڑ جائے وہاں مردانگی کی چھاپ سند بن جاتی ہے۔

وہ ایسی ہی ہے۔ اس نے میرے دل سے دماغ سے حمیرا کے تمام نقوش مٹا دیئے اور اس دن سے آج تک مجھ پر حکمرانی کر رہی ہے۔ آج اگر وہ سامنے والا راستہ دکھائی نہ دیتا اور وہ محلّہ یاد نہ آتا تو شاید حمیرا بھی مجھے یاد نہ آتی۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی کار سامنے آکر رک گئی۔ ڈرائیور کار سے باہر نکلا۔ اس نے ظلِ سبحانی کو سلام کیا۔ دوسری طرف سے گھوم کر آتے ہوئے پچھلی سیٹ کا دروازہ ان کے لئے کھول دیا۔ ظلِ سبحانی نے رفیق کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو وہ بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دروازہ بند ہوا۔ ڈرائیور نے اپنی سیٹ سنبھالی۔ اس کے بعد کار اسٹارٹ کرتے ہوئے آگے بڑھا دی۔ ظلِ سبحانی نے رفیق سے پوچھا۔ "ہاں، اس خط میں زُبا نے کیا پتہ لکھ کر دیا ہے، مجھے سناؤ۔"

رفیق نے کہا۔ "ہائی وے نمبر ۲۵ پر بہت دور ایک جھیل کنول ہے، اس جھیل کنول کے قریب ہی دو منزلہ عمارت ہے۔ اس عمارت پر جلی حرفوں میں لکھا ہے 'آخری اسٹیشن'، مجھے اسی آخری اسٹیشن تک جانا ہے۔"

ظلِ سبحانی بڑی توجہ سے اور حیرانی سے سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "یہ عمارت تو



ہم نے بنوائی تھی اور اس سلسلے میں زُبا نے بڑی دلچسپی لی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ ہم وہاں اپنا آخری ٹھکانہ بنائیں گے۔ اوہ، مائی گاڈ، اب مجھے یاد آ رہا ہے۔ اس نے ایک بار کہا تھا ہم اپنے شہر کے تمام مظلوم بوڑھے اور بوڑھیوں کو اس آخری اسٹیشن میں بلائیں گے۔ ان کی رہائش کا اور ان کے زندگی گزارنے کا انتظام کریں گے۔ اگرچہ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اخراجات اتنے ہوتے ہیں کہ ان کا بوجھ ایک حکومت بھی تنہا نہیں اٹھا سکتی۔ ہم تو محض کروڑ پتی ہیں۔ اکیلے یہ کام نہیں کر سکتے۔"

رفیق نے کہا۔ "میرا خیال ہے۔ یہ کام ہو رہا ہے یا ہو چکا ہے تبھی اس نے مجھے وہاں کا پتہ دیا ہے۔"

ظلِ سبحانی نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہاں، وہ بہت ہی ضدی اور مستقل مزاج ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ یہ کام کر دکھائے گی۔ حکومت سے تعاون حاصل کرے گی۔ اس شہر کے بڑے بڑے کروڑ پتی اور ارب پتی سرمایہ داروں سے رابطہ قائم کرے گی اور انہیں ایک آخری اسٹیشن بنانے پر آمادہ کرلے گی۔ شاید اس نے ایسا کر لیا ہے۔"

اس نے ڈرائیور کو جھیل کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ پھر کہا۔ "وہ آخری اسٹیشن یہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ میں اتنی دور تمہیں چھوڑنے کے لئے کبھی نہ جاتا مگر اب مجھے یقین ہو رہا ہے زُبا وہیں گئی ہے۔ اس نے وہیں پناہ لی ہے۔ وہاں وہ ضرور مل جائے گی۔"

"تم کیسے شوہر ہو۔ تمہاری بیوی نے اتنا بڑا کام کیا اور تمہیں اس کا علم ہی نہیں ہے۔ ہے بھی تو نہ ہونے کے برابر۔"

"زُبا نے ضد کی تھی کہ میں اس کا ساتھ دوں لیکن کاروباری مصروفیات کے باعث میں اس کے سماجی کاموں میں دلچسپی نہیں لے سکتا تھا اور یہی سوچتا تھا کہ عورتوں میں سوشل ورک کا ایک کریز ہے اور یہ جلد ہی ختم بھی ہو جاتا ہے۔ ایک دن زُبا بھی ٹھنڈی ہو کر بیٹھ جائے گی۔"

رفیق نے دل میں سوچا۔ "وہ ٹھنڈی نہیں ہے۔ آج بھی ہماری رگوں میں گرم لہو کی طرح دوڑ رہی ہے۔"

انہوں نے شہر سے دور چالیس میل کا فاصلہ طے کر لیا۔ اس آخری اسٹیشن کی عمارت کے پاس کتنی ہی رنگ برنگی قیمتی کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ عورتیں بھی نظر

آرہی تھیں اور مرد بھی۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ اوپن ایئر ریستوران آباد تھے لیکن ایک بات جو خاص طور پر دیکھنے میں آئی وہ یہ تھی کہ وہاں سب بوڑھے تھے یا بوڑھیاں تھیں' دکان دار بھی بوڑھے نظر آرہے تھے۔

ان کی کار عمارت کے قریب جہاں رکی' وہاں سامنے ہی دفتر معلومات کا ایک بورڈ لگا ہوا تھا۔ وہ کار سے اتر کر ادھر جانے لگے۔ ظلِ سبحانی نے کہا۔ "یہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے' میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس عمارت کو رُبا نے میری کمائی سے بنایا ہے۔"

وہ دفتر معلومات کے کاؤنٹر پر پہنچ گئے۔ ظلِ سبحانی نے کاؤنٹر کلرک سے پوچھا۔ "کیا بیگم رُبابہ سبحانی سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"جی ہاں' آپ اپنا نام بتائیں۔"

"میں ان کا شوہر ظلِ سبحانی ہوں۔"

رفیق نے جلدی سے کہا۔ "اور میں بھی ان سے ملنے آیا ہوں۔ انہوں نے مجھے ایک خط کے ذریعے مشورہ دیا تھا کہ میں یہاں آؤں گا تو میرے رہنے سہنے کے انتظامات ہو جائیں گے۔"

کاؤنٹر کلرک نے ایک ڈائری کھولی۔ اس نے ایک صفحے پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "مسٹر رفیق! کیا آپ ریلوے میں چارج مین تھے۔ اس کے بعد ریٹائر ہو گئے اور محلہ رحیم پورہ میں جاکر اپنے بیٹے اور بیوی کے ساتھ رہنے لگے؟"

رفیق نے جلدی سے سر ہلا کر کہا۔ "جی ہاں' جی ہاں میں وہی رفیق ہوں۔"

"آپ گراؤنڈ فلور کے کمرہ نمبر سولہ میں جائیں۔ وہاں آپ کے ضروری کاغذات تیار کئے جائیں گے اور مسٹر ظلِ سبحانی آپ کی آمد پر ہمیں بے حد خوشی ہے۔ ہم آپ کے خادم ہیں' آپ اوپری منزل کے کمرہ نمبر پچیس میں تشریف لے جائیں' شاید وہاں بیگم صاحبہ سے ملاقات ہو جائے۔"

وہ دونوں وہاں سے گھوم کر عمارت کے مین انٹرنس کی طرف جانے لگے۔ رفیق نے کہا۔ "میں پہلے رُبا سے ملاقات کروں گا۔ پھر کمرہ نمبر سولہ میں جاؤں گا۔"

ظلِ سبحانی چلتے چلتے رک گیا۔ پھر غصے سے بولا۔ "جب تمہارے رہنے سہنے کا ٹھکانہ ہو گیا ہے تو پھر کیوں ہمارا پیچھا کر رہے ہو؟"



"ایک بار میں رُبا سے ضرور ملاقات کروں گا۔"

ظلِ سبحانی نے غصے اور نفرت سے اسے دیکھا۔ پھر کوئی جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ جب وہ دونوں داخلی دروازے کے قریب پہنچے تو ظلِ سبحانی ٹھٹک گیا۔ سامنے کھڑے مسلح چوکیدار کو دیکھنے لگا۔ رفیق نے پوچھا۔ "کیا بات ہے آگے کیوں نہیں بڑھتے۔ بات کیوں نہیں کرتے؟"

اسی وقت اس مسلح چوکیدار نے ظلِ سبحانی کو دیکھ لیا تھا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے پرانے شناسا ہوں اور ایک دوسرے کو پہچان لینے کا یقین کر رہے ہوں' پھر ظلِ سبحانی نے آگے بڑھ کر حیرانی سے پوچھا۔ "تم! جبرو دادا یہ تم ہو؟"

جبرو دادا نے رائفل کو زمین پر یوں ٹیک دیا جیسے لاٹھی ٹیک کر کھڑے رہنے کی سکت حاصل کر رہا ہو۔ پھر وہ ایک اسٹول پر بیٹھ گیا اور شکست خوردہ لہجے میں کہنے لگا۔ "ہاں' یہ میں ہوں۔ مجھے دیکھو۔ میں اپنے وقت کا بہت بڑا شہ زور' اور اس وقت نے ہی مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے۔"

وہ دونوں اس کے قریب آگئے۔ اس نے کہا۔ "میں طاقت کے نشے میں یہ بھول گیا تھا کہ طاقت اور اقتدار کی کرسی ایک ہوتی ہے۔ اس پر بیٹھنے والے بدلتے رہتے ہیں۔ جس محلے میں میری دھاک جمی ہوئی تھی وہاں وقت کے ساتھ ساتھ دوسرے بدمعاش نے اپنا سکہ جمالیا۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ نہ تو میں شہ زور ہوں۔ نہ دلیر ہوں' میں اس علاقے کا دادا نہیں ہوں بلکہ تھانیدار کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہوں' تھانیدار جس کا ساتھ دے وہی اس علاقے کا دادا ہوتا ہے۔ لہٰذا تھانیدار نے دوسرے بدمعاش کا ساتھ دیا اور میرے اقتدار کا دور ختم ہو گیا۔"

وہ کہتے کہتے ذرا جھک گیا۔ جیسے جوانی کی اور شہ زوری کی کمر ٹوٹ گئی ہو۔ پھر اس نے کہا۔ "یہ اب سے تیس بتیس برس پہلے کی بات ہے۔ اس وقت سے میں چھوٹی چھوٹی وارداتیں کرتا رہا۔ چھوٹے چھوٹے علاقوں میں جاکر پولیس والوں سے دوستی کرتا رہا۔ کہیں کامیابی ہوتی تھی کہیں ناکامی' کہیں چوری بدمعاشی کرتا تھا۔ کہیں پکڑا جاتا تھا۔ زندگی کا بہت سا حصہ جیل میں گزارا۔ دو ماہ پہلے سزا کاٹ کر باہر آیا تو اب کی بار بالکل ہی ٹوٹ چکا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کروں؟ کیسے زندگی گزاروں؟

جوانی میں بڑا ناز تھا۔ سوچتا تھا۔ اسی طرح عیش و عشرت میں زندگی گزر جائے گی۔ اب تو چوری کے لئے کہیں ہاتھ بڑھاتا ہوں تو ہاتھ کانپنے لگتے ہیں۔ اگر چوری کرنے میں کہیں کامیاب ہو بھی جاؤں تو مال لے کر بھاگ نہیں سکتا۔ بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب تو چلتے چلتے ہانپ جاتا ہوں۔ بیٹھ جاتا ہوں۔"

ظلِ سبحانی نے پوچھا۔ "یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

جبرو دادا نے کہا۔ "عجیب اتفاق ہے۔ میں نے سوچا اپنی زندگی کا یہ باقی حصہ اسی علاقے میں گزاروں جہاں کبھی میرا رعب اور دبدبہ تھا۔ میں وہاں گیا۔ وہ علاقہ بالکل بدل گیا ہے۔ جہاں پان کی وہ دکان تھی۔ یعنی جہاں تم نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ وہ پان والا اب بہت بڑے جنرل اسٹور کا مالک بن گیا ہے' اس کے بیٹے اور پوتے دکان سنبھالتے ہیں' مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس علاقے کے کسی بھی آدمی نے مجھے نہیں پہچانا۔ پہچان لیتے تو بے عزتی ہوتی۔ جہاں میں راج کرتا تھا' وہاں ایک ٹوٹے ہوئے آدمی کی طرح آیا تھا۔ وہاں ہر چہرہ نیا تھا۔ پرانے لوگ یا تو مرگئے تھے یا اتنے بوڑھے ہوگئے تھے کہ گھروں سے نہیں نکلتے تھے۔ نکلتے بھی تھے تو بینائی کمزور ہوگئی تھی مجھے پہچان نہیں سکتے تھے۔

تب میں نے اسی سڑک کے کنارے بیٹھ کر اپنا ہاتھ کاسے کی طرح آگے بڑھادیا۔ میری ہتھیلی پر سکے گرنے لگے۔ ایک پیسہ' پانچ پیسے' دس پیسے' میری آنکھیں آنسوؤں سے دھندلانے لگیں۔ وہ ہاتھ جو چھین لیا کرتے تھے' ان ہاتھوں کو خیرات مل رہی تھی۔ اگر اس وقت جوانی واپس مل جاتی۔ وہی طاقت' وہی توانائی حاصل ہو جاتی اور پولیس والے میرے پیٹھ پیچھے میری قوت بن جاتے تو کیا میں اسی طرح مانگتا؟ نہیں' جو خیرات دینے والے میرے پاس سے گزر رہے تھے میں ان کی جیب میں ہاتھ ڈال کر جو نوٹوں کی گڈیاں نکال لیتا۔ یہ وقت وقت کی بات ہے۔ ہم کبھی سر پر سوار ہو کر دوسروں کو مجبور کردیتے ہیں اور کبھی اتنے مجبور ہوتے ہیں کہ قدموں میں جھک جاتے ہیں۔ ہم انسانوں کے درمیان طاقت کا توازن نہیں ہے۔ ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہمیں پچھتانا ہوگا بڑھاپے میں پچھتائیں گے۔ جوانی صرف کر گزرنے کا نام ہے۔"

ظلِ سبحانی نے کہا۔ "میں اپنی بیوی سے ملنے جارہا ہوں۔ تم مجھے جلدی سے بتادو یہاں تک کیسے پہنچے؟"



"وہی بتارہا ہوں۔ جب میں سڑک کے کنارے بیٹھ گیا تو ایک دن ایک بہت ہی قیمتی کار اسی جنرل اسٹور کے سامنے آکر رکی۔ ایک بیگم صاحبہ بہت ہی قیمتی لباس پہنے ہوئے تھیں وہ گاڑی سے نکل کر اسٹور میں گئیں۔ وہاں کچھ خریدنے لگیں خریدنے کے دوران انہوں نے ایک بار مجھے دیکھا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ بار بار مجھے دیکھ رہی ہیں کبھی کچھ خریدتی ہیں کبھی سرگھما کر میری طرف دیکھنے لگتی تھیں۔ میں کار کے پاس آکر کھڑا ہوگیا تھا۔ وہ خریداری کے بعد واپس آئیں تو میں نے ان کے سامنے ہاتھ پھیلادیا۔ ڈرائیور خریدا ہوا سامان پچھلی سیٹ پر رکھ رہا تھا۔ بیگم صاحبہ نے مجھے دیکھ کر آہستگی سے پوچھا۔ "تم جبرو دادا ہو؟"

میں سنتے ہی ایک دم سے چونک گیا۔ انہیں غور سے دیکھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنی بڑی بیگم صاحبہ مجھے کیسے پہچانتی ہیں۔ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟"

جواب میں بیگم صاحبہ نے اپنا دایاں ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ پھر کہا۔ "میری کلائی پکڑلو۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیوں' میں کیوں پکڑوں۔ لوگ کیا کہیں گے؟"

"جبرو! آج سے بیالیس برس سات ماہ پہلے تم نے یہ نہیں سوچا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے۔"

میں نے اس کے حساب کے مطابق بیالیس برس سات ماہ پہلے کی بات یاد کرنے کی کوشش کی۔ دراصل میری بدمعاشیوں کی فہرست اتنی طویل ہے' میں نے اپنی زندگی میں اتنی لڑکیوں اور عورتوں کو چھیڑا ہے کہ بیگم صاحبہ کو یاد نہ رکھ سکا۔ میں نے کہا۔ "بیگم صاحبہ! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں نے آج سے پہلے آپ کو کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی آپ کی کلائی پکڑی ہے۔"

"چلو' میں مان لیتی ہوں' تم مجھ سے کتنی خیرات کی توقع رکھتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "روٹی کھانے کے لئے دو روپے دے دیجئے۔"

انہوں نے پھر اپنی کلائی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں دو سو روپے دوں گی۔ میری کلائی کو اتنی مضبوطی سے جکڑلو کہ میری چیخ نکل پڑے۔"

میں نے حیران اور پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا آپ چاہتی ہیں کہ لوگ مجھے جوتے

جوانی میں بڑا ناز تھا۔ سوچتا تھا۔ اسی طرح عیش و عشرت میں زندگی گزر جائے گی۔ اب تو چوری کے لئے کہیں ہاتھ بڑھاتا ہوں تو ہاتھ کانپنے لگتے ہیں۔ اگر چوری کرنے میں کہیں کامیاب ہو بھی جاؤں تو مال لے کر بھاگ نہیں سکتا۔ بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب تو چلتے چلتے ہانپ جاتا ہوں۔ بیٹھ جاتا ہوں۔"

ظلِ سبحانی نے پوچھا۔ "یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

جبرو دادا نے کہا۔ "عجیب اتفاق ہے۔ میں نے سوچا اپنی زندگی کا یہ باقی حصہ اسی علاقے میں گزاروں جہاں کبھی میرا رعب اور دبدبہ تھا۔ میں وہاں گیا۔ وہ علاقہ بالکل بدل گیا ہے۔ جہاں پان کی وہ دکان تھی۔ یعنی جہاں تم نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ وہ پان والا اب بہت بڑے جنرل اسٹور کا مالک بن گیا ہے' اس کے بیٹے اور پوتے دکان سنبھالتے ہیں' مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس علاقے کے کسی بھی آدمی نے مجھے نہیں پہچانا۔ پہچان لیتے تو بے عزتی ہوتی۔ جہاں میں راج کرتا تھا' وہاں ایک ٹوٹے ہوئے آدمی کی طرح آیا تھا۔ وہاں ہر چہرہ نیا تھا۔ پرانے لوگ یا تو مر گئے تھے یا اتنے بوڑھے ہو گئے تھے کہ گھروں سے نہیں نکلتے تھے۔ نکلتے بھی تھے تو بینائی کمزور ہو گئی تھی' مجھے پہچان نہیں سکتے تھے۔

تب میں نے اسی سڑک کے کنارے بیٹھ کر اپنا ہاتھ کاسے کی طرح آگے بڑھا دیا۔ میری ہتھیلی پر سکے گرنے لگے۔ ایک پیسہ' پانچ پیسے' دس پیسے' میری آنکھیں آنسوؤں سے دھندلانے لگیں۔ وہ ہاتھ جو چھین لیا کرتے تھے' ان ہاتھوں کو خیرات مل رہی تھی۔ اگر اس وقت جوانی واپس مل جاتی۔ وہی طاقت' وہی توانائی حاصل ہو جاتی اور پولیس والے میرے پیٹھ پیچھے میری قوت بن جاتے تو کیا میں اسی طرح مانگتا؟ نہیں' جو خیرات دینے والے میرے پاس سے گزر رہے تھے میں ان کی جیب میں ہاتھ ڈال کر جبراً نوٹوں کی گڈیاں نکال لیتا۔ یہ وقت وقت کی بات ہے۔ ہم کبھی سر پر سوار ہو کر دوسروں کو مجبور کر دیتے ہیں اور کبھی اتنے مجبور ہوتے ہیں کہ قدموں میں جھک جاتے ہیں۔ ہم انسانوں کے درمیان طاقت کا توازن نہیں ہے۔ ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہمیں پچھتانا ہو گا بڑھاپے میں پچھتائیں گے۔ جوانی صرف کر گزرنے کا نام ہے۔"

ظلِ سبحانی نے کہا۔ "میں اپنی بیوی سے ملنے جا رہا ہوں۔ تم مجھے جلدی سے بتا دو یہاں تک کیسے پہنچے؟"



"وہی بتا رہا ہوں۔ جب میں سڑک کے کنارے بیٹھ گیا تو ایک دن ایک بہت ہی قیمتی کار اسی جنرل اسٹور کے سامنے آکر رکی۔ ایک بیگم صاحبہ بہت ہی قیمتی لباس پہنے ہوئے تھیں وہ گاڑی سے نکل کر اسٹور میں گئیں۔ وہاں کچھ خریدنے لگیں خریدنے کے دوران انہوں نے ایک بار مجھے دیکھا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ بار بار مجھے دیکھ رہی ہیں کبھی کچھ خریدتی ہیں کبھی سر گھما کر میری طرف دیکھنے لگتی تھیں۔ میں کار کے پاس آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ خریداری کے بعد واپس آئیں تو میں نے ان کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔ ڈرائیور خریدا ہوا سامان پچھلی سیٹ پر رکھ رہا تھا۔ بیگم صاحبہ نے مجھے دیکھ کر آہستگی سے پوچھا۔ "تم جبرو دادا ہو؟"

میں سنتے ہی ایک دم سے چونک گیا۔ انہیں غور سے دیکھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنی بڑی بیگم صاحبہ مجھے کیسے پہچانتی ہیں۔ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟"

جواب میں بیگم صاحبہ نے اپنا دایاں ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ پھر کہا۔ "میری کلائی پکڑ لو۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیوں' میں کیوں پکڑوں۔ لوگ کیا کہیں گے؟"

"جبرو! آج سے بیالیس برس سات ماہ پہلے تم نے یہ نہیں سوچا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے۔"

میں نے اس کے حساب کے مطابق بیالیس برس سات ماہ پہلے کی بات یاد کرنے کی کوشش کی۔ دراصل میری بدمعاشیوں کی فہرست اتنی طویل ہے' میں نے اپنی زندگی میں اتنی لڑکیوں اور عورتوں کو چھیڑا ہے کہ بیگم صاحبہ کو یاد نہ رکھ سکا۔ میں نے کہا۔ "بیگم صاحبہ! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں نے آج سے پہلے آپ کو کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی آپ کی کلائی پکڑی ہے۔"

"چلو' میں مان لیتی ہوں' تم مجھ سے کتنی خیرات کی توقع رکھتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "روٹی کھانے کے لئے دو روپے دے دیجئے۔"

انہوں نے پھر اپنی کلائی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں دو سو روپے دوں گی۔ میری کلائی کو اتنی مضبوطی سے جکڑ لو کہ میری چیخ نکل پڑے۔"

میں نے حیران اور پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا آپ چاہتی ہیں کہ لوگ مجھے جوتے

ماریں اور پولیس والے پکڑ کر لے جائیں۔"

انہوں نے میری بات پر ذرا غور کیا۔ پھر کہا۔ "اچھا' پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہاری روزی اور روٹی کا بندوبست کر دیتی ہوں۔"

میں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ اگلی سیٹ پر آگئیں۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ انہوں نے ڈرائیور سے کہا۔ "ہائی وے کی طرف چلو۔" گاڑی چلنے لگی۔ کافی لمبا سفر تھا۔ میں چپ چاپ پچھلی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ یہاں جھیل کنول کے قریب آکر انہوں نے گاڑی روکنے کو کہا۔ ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی۔ پھر انہوں نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ "اب تم یہاں سے پیدل آخری اسٹیشن تک جاؤ' میں خود ہی ڈرائیو کر کے آجاؤں گی۔"

ڈرائیور وہاں سے چلا گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھی رہیں۔ جب وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو انہوں نے کہا۔ "اب آؤ۔ یہاں کوئی تمہیں جوتے مارنے والا یا پکڑ کر تھانے لے جانے والا نہیں ہے۔ لو' میری کلائی مضبوطی سے جکڑ لو۔"

میں نے پریشان ہو کر ان کی گوری گوری کلائی کو دیکھا۔ وہ بولیں۔ "دیکھو ڈرائیور بھی جا چکا ہے' وہ میرا ہیرو بھی موجود نہیں ہے جس نے تمہیں گولی مار کر زخمی کیا تھا۔"

تب میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ چشم زدن میں مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ میں نے ایک دم سے حیران اور پریشان ہو کر پوچھا۔ "آپ' آپ وہی لڑکی ہیں جو پان کی دکان.........."

وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ "چلو تمہیں یاد تو آیا۔ لو' اب اسے پکڑ لو۔ اتنی مضبوطی سے جیسے اس روز پکڑا تھا اور میری یہ کلائی بالکل سرخ ہو گئی تھی۔"

میں نے نادم ہو کر کہا۔ "آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔"

"میں تمہیں شرمندہ نہیں کر رہی ہوں اور نہ یہ چاہتی ہوں کہ تم نے جو کچھ کیا ہے اس کی معافی مانگو۔ جو میں کہہ رہی ہوں اس پر عمل کرو۔"

"نہیں بیگم صاحبہ' مجھے معاف کر دیجئے۔ آپ کی کلائی پکڑنا تو دور کی بات ہے میں



آپ کو چھونے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔"

"میں تمہیں اجازت دے رہی ہوں۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ دو سو روپے دوں گی چلو' دو ہزار دوں گی مگر پہلے جیسے بانکپن سے میری کلائی پکڑ لو۔"

وہ مجبور کرنے لگیں' میں نے حوصلہ کیا' اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ کو آگے بڑھایا۔ پھر ان کی اس کلائی کو مضبوطی سے تھام لیا۔ انہوں نے کہا۔ "میں نے صرف پکڑنے کے لئے نہیں کہا۔ جکڑنے کے لئے کہا ہے۔"

میں نے جکڑنا شروع کیا۔ پوری طاقت صرف کر دی۔ ستر برس کی تمام قوتوں کو آزمایا۔ وہ بولیں۔ "تم ایسے پکڑ رہے ہو' جیسے بھائی اپنی بہن کا اور باپ اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑتا ہے۔"

یہ سنتے ہی میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے منہ کو چھپالیا۔ میں سچ کہتا ہوں' زندگی میں پہلی بار کسی عورت کے سامنے رونا آگیا' یہ مرد کی کمزوری ہوتی ہے لیکن میں تو اسی کمزوری پر رو رہا تھا اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

تھوڑی دیر تک وہاں خاموشی چھائی رہی پھر بیگم صاحبہ نے کہا۔ "میں تمہیں الزام نہیں دے رہی ہوں۔ ہم دونوں ہی خطاوار ہیں۔ اگر میں اپنے والد کا گھر چھوڑ کر نہ بھاگتی اور سڑکوں پر تنہا نہ ہوتی تو تم میری کلائی پکڑنے کی جرأت نہ کرتے۔ میں نے موقع دیا۔ تم نے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ مجھے بھی اس عمر پر آنسو بہانا چاہئے جب لڑکیاں نادانی کرتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بیگم صاحبہ! میں اس بات پر حیران ہوں کہ آپ نے اتنی عمر گزارنے کے بعد بھی مجھے یاد رکھا ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "عورت کی کلائی اتنی سستی نہیں ہوتی جتنی مرد کی نیت سستی ہوتی ہے۔ جو اسے ایک بار تھام لیتا ہے وہ ہماری یادداشت میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ پکڑنے والا اچھا ہو یا برا ہو وہ صرف اس کی چاہت کو دیکھتی ہے۔ یہ ہمارا حوصلہ ہے کہ ہم بری نیت کو رفتہ رفتہ معاف کر دیتی ہیں یا پھر وقت ہمیں معاف کر دینا سکھا دیتا ہے۔"

انہوں نے میری طرف سے پلٹ کر اسٹیئرنگ سیٹ سنبھال لی۔ پھر گاڑی کو اسٹارٹ کرتے ہوئے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ ہماری تمہاری زندگی کا آخری موسم ہے۔ دستور کے مطابق ہمیں کھانسنا' کھنکارنا' بلغم تھوکنا اور اپنے اعمال پر پچھتانا

چاہئے۔ نئی نسل ہمیں طعنے دیتی ہے۔ ہماری غلطیوں کا محاسبہ کرتی ہے۔ جوانی میں جو نقصانات ہوتے ہیں ان کا الزام بڑھاپے کے سر تھوپ دیتی ہے۔ عام بوڑھوں کی طرح ہمیں احساسِ کمتری میں مبتلا ہونا چاہئے لیکن نہیں' اب ہم تمام بوڑھے اپنا ایک ٹھکانہ بنائیں گے۔ ہم یہ ثابت کریں گے کہ اس عمر میں ہم بالکل ہی ریٹائر نہیں ہو جاتے ہمارے پاس جو صلاحیتیں ہیں ان سے ابھی بڑی حد تک کام لیا جا سکتا ہے۔ ہمیں نظر انداز کرنے کے بجائے ہماری طرف توجہ دی جا سکتی ہے۔ جوانوں کی زندگی اتنی تیز رفتار ہوتی ہے کہ وہ توجہ نہیں دے سکتے۔ ہم ہی اپنے لئے کچھ کر سکتے ہیں۔"

"اور کچھ کرنے کے لئے بیگم صاحبہ مجھے اس آخری اسٹیشن میں لے آئی ہیں مجھے یہ وردی دی ہے۔ یہ رائفل میرے پاس رہتی ہے۔"

رفیق نے پوچھا۔ "ہم بوڑھے تو امن پسند ہوتے ہیں پھر یہ رائفل کس مقصد کے لئے ہے؟"

جبرو نے کہا۔ "میں نہیں جانتا کہ مجھے اس رائفل سے کیا کام لینا ہے۔ بیگم صاحبہ نے حکم دیا کہ یہ رائفل لے کر یہاں دروازے پر کھڑا رہوں اور جب میں اسے لے کر کھڑا رہتا ہوں تو اپنے بڑھاپے کو بھول جاتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے میرے پاس کوئی طاقت ہے اور یہ رائفل مجھے لوگوں کی نظروں میں بھاری بھرکم بنا رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بیگم صاحبہ نے میری سابقہ شہ زوری کی مناسبت سے مجھے یہاں کھڑا کر دیا۔ میری انا اور خودداری کو تسکین پہنچا رہی ہیں۔"

ظلِ سبحانی نے سینہ تان کر فخر سے رفیق کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آخر بیوی کس کی ہے؟"

یہ کہہ کر وہ عمارت میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ رفیق لگا رہا۔ آس پاس دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹرز چسپاں تھے۔ ان میں طرح طرح کی حوصلہ افزا تحریریں تھیں۔ بوڑھوں کو سمجھایا جا رہا تھا کہ وہ کسی طرح بھی احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہوں کسی محرومی کو اپنے دل میں جگہ نہ دیں۔ آخری اسٹیشن میں ان کی تمام محرومیوں کا علاج ہے۔

کسی پوسٹر پر لکھا تھا۔ آپ بیماریوں سے مایوس نہ ہوں۔ ایسا کون سا جوان ہے جو بیماریوں میں مبتلا نہیں رہتا۔ یہ بیماریاں جوانوں اور بوڑھوں میں مشترک ہوتی ہیں۔



ایک دروازے پر ایمرجنسی وارڈ کی تختی لگی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک پوسٹر چسپاں تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔ یہاں آپ پر فوری توجہ دی جاتی ہے۔ پھر یہاں سے دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک اسپتال میں پہنچایا جاتا ہے وہاں پہنچانے کے لئے گاڑی کا معقول انتظام ہے' آپ اس یقین کے ساتھ آئیں کہ آپ کی مسلسل بیماریوں سے بیزار ہونے والے رشتے دار یہاں نہیں ہیں۔

اس عمارت کا ہر کمرہ دفتر تھا اور ہر دفتر کے سامنے بوڑھے اور بوڑھیاں خاصی تعداد میں نظر آ رہے تھے۔ کمرہ نمبر سولہ میں جہاں رفیق کو جانے کے لئے کہا گیا تھا' وہاں بھی برآمدے میں پڑی ہوئی بنچ پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بوڑھے بھی تھے اور بوڑھیاں بھی تھیں۔ سبھی اس آخری اسٹیشن میں رہنے کے لئے اپنے کاغذات تیار کروا رہے تھے۔

وہ دونوں ایک زینے کے پاس پہنچ گئے' ایک عورت اوپر سے نیچے آ رہی تھی۔ اس کا لباس اور اس کے زیورات بتا رہے تھے کہ وہ کسی بڑے گھر کی بیگم صاحبہ ہے۔ اس نے ظلِ سبحانی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا میں آپ کی رہنمائی کر سکتی ہوں؟"

اس نے کہا۔ "ہم رُبا خاتون سے ملنے جا رہے ہیں۔ کیا وہ موجود ہیں؟"

عورت نے کہا۔ "آج ان سے میری ملاقات نہیں ہوئی ہے' ہو سکتا ہے کہ موجود ہوں۔ آپ پچیس نمبر میں چلے جائیں' اوپر کے تمام دفاتر آخری اسٹیشن کے نمائندہ حضرات اور بیگمات کے لئے وقف ہیں۔"

وہ جانے لگی' پھر پلٹ کر بولی۔ "اس عمر میں زینہ چڑھنا گویا کہ ہمالیہ کی چوٹی سر کرنا ہے۔ جب میں اوپر گئی تو ہانپ گئی تھی۔ اسٹیشن منیجر کہہ رہا تھا جلد ہی یہاں ایک متحرک زینہ لگایا جائے گا۔"

وہ دونوں زینے پر چڑھتے ہوئے اوپر کی طرف جانے لگے عورت نے ان کی طرف دیکھا۔ مسکرائی پھر پلٹ کر اپنی راہ جانے لگی وہ دونوں اوپر پہنچ گئے۔ زینے کے سامنے ہی پچیس نمبر کا کمرہ تھا۔ ایک دروازے پر بیگم رُبابہ سبحانی کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ وہ دروازہ بند تھا اس کے ساتھ ہی دوسرا دروازہ کھلا ہوا تھا وہاں ایک چپراسی ایک اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس دروازے پر جو تختی لگی ہوئی تھی اسے پڑھ کر دونوں چونک گئے۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔ "مس رُبا۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ایک طرف رُبابہ اور دوسری طرف مس رُبا کے نام کی تختی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ آگے بڑھے ظلِ سبحانی نے بوڑھے چپراسی سے کہا۔ "میں رُبا سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرا نام ظلِ سبحانی ہے۔"

چپراسی فوراً اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر سلام کرتے ہوئے انکساری سے بولا۔ "حضور یہ تو آپ ہی کا دفتر ہے۔"

دروازے پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ دونوں نے آگے بڑھ کر پردے کو ہٹایا جیسے کسی راز سے پردہ اٹھا رہے ہوں۔ پردہ اٹھ گیا مگر راز' راز ہی رہا' سامنے ایک اٹھارہ برس کی دوشیزہ کو' اپنی اسی رُبا کو دیکھ کر وہ جہاں تھے وہیں تھم گئے۔ آگے بڑھنا بھول گئے۔ وہ ایک بڑی سی میز کے پیچھے ایک بڑی سی کرسی پر بیٹھی ہوئی' میز پر جھکی ہوئی کسی فائل کو پڑھنے میں مصروف تھی۔ آہٹ ہوتے ہی اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

ان دونوں نے اب تک جس رُبا کو دیکھا تھا۔ وہ خیالی تھی اور جو سامنے بیٹھی ہوئی تھی' وہ یقیناً خیالی نہیں تھی' اس کا ایک وجود تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی پہلے اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر سوال کیا۔ "آپ کون ہیں؟"

"میرا نام ظلِ سبحانی ہے۔"

وہ ایک دم سے چونک گئی۔ پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ "آپ' آپ ہمارے صاحب ہیں' آیئے تشریف لایئے۔"

وہ دونوں جوں کے توں کھڑے رہے۔ اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے رہے' پہلے وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ پوری طرح نظر نہیں آرہی تھی۔ اب نگاہوں کے سامنے پوری کی پوری تھی اور وہ سوچ رہے تھے کیا انہوں نے اب تک خیالوں میں خوابوں میں اور تصوراتی نگاہوں کے سامنے اسی دوشیزہ کو دیکھا ہے۔ اسی کو جس کا نام رُبابہ ہے؟

اب سے بیالیس برس پہلے قد ویسا ہی تھا۔ جسامت بھی ویسی ہی تھی۔ چہرہ کچھ کچھ ویسا ہی لگ رہا تھا۔ ناک نقشہ بالکل ویسا ہی تھا یا نہیں اس کے متعلق پوری طرح یقین نہیں تھا کیونکہ وہ تصور میں رُبا کو دور سے دیکھتے رہے تھے اور بڑھاپے نے ان کی دور کی نظر کمزور کردی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نظر کمزور ہو تو کیا تصور میں بھی دور کی چیزیں دھندلی دکھائی دیتی ہیں یا اتنی صاف نظر نہیں آتیں' بس سراب ہوتا ہے جو پیاسوں کو اپنی طرف بلاتا رہتا ہے۔



دوشیزہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "جناب! آپ لوگ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟"

رفیق نے چونک کر پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟ ہمارا مطلب یہ ہے کہ وہاں تو مس رُبا لکھا ہے' پورا نام کیا ہے؟"

"دلرُبا شبنم۔ میں محترمہ رُبابہ خاتون کی سیکرٹری ہوں۔"

"لیکن یہ آخری اسٹیشن تو بوڑھوں اور بوڑھیوں کے لئے ہے۔"

"یہاں دولت مند حضرات کسی لڑکی' عورت یا نوجوان مرد کو اپنے اخراجات پر ملازم رکھ سکتے ہیں' وہ اپنی سہولتوں کے لئے ایسا کرسکتے ہیں۔ اس اوپری منزل کے دفاتر میں پانچ لڑکیاں اور دس لڑکے ملازم ہیں۔"

ظلِ سبحانی نے پوچھا۔ "مس رُبا' یہ دفتر کس کا ہے؟"

"مادام رُبابہ سبحانی کا ہے' آپ کا بھی ہے' سر۔"

"ٹھیک ہے' مسٹر رفیق سے کہو کہ اس دفتر سے جائیں اور اپنے کام سے تعلق رکھیں' انہیں کمرہ نمبر سولہ میں جانا چاہئے۔"

رُبا نے رفیق کی جانب دیکھا۔ رفیق نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ "میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

ظلِ سبحانی نے کہا۔ "دفتر میں ذاتی گفتگو نہیں ہوسکتی۔"

رُبا نے رفیق کو دیکھتے ہوئے ہمدردی سے کہا۔ "آپ کمرہ نمبر سولہ میں جائیں۔ تین بجے میری ڈیوٹی ختم ہوجائے گی۔ پھر میں آپ سے ملاقات کروں گی۔"

رفیق خوش ہوکر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ظلِ سبحانی نے کہا۔ "میں اپنی بیگم کا دفتر دیکھنا چاہتا ہوں۔ دروازہ کھولو۔"

رُبا نے ایک درمیانی دروازے کو کھولا۔ دوسری طرف رُبابہ کا دفتر تھا۔ ظلِ سبحانی نے وہاں پہنچ کر دیکھا۔ فرش پر بہت ہی قیمتی قالین تھا۔ میز' کرسیاں اور دوسرے دفتری سامان بھی بہت قیمتی تھے۔ وہ بظاہر اس دفتری کمرے کا معائنہ کر رہا تھا لیکن اندر ہی اندر ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اسے احساس تھا کہ اس بند کمرے میں ایک نوجوان رُبا ہے۔ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اب تو سالہا سال گزر چکے تھے' اس عرصہ میں کسی جوان لڑکی کو ایک بند کمرے میں مخاطب نہیں کیا تھا۔ بلکہ کسی ایسے

کمرے میں ایسی لڑکی کو دیکھا تک نہیں تھا۔

وہ ذرا سنبھلنے کے لئے' ذرا سوچنے کے لئے بڑی سی میز کے پیچھے زُبا کی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا' پھر اس نے پوچھا۔ "تم یہاں کب آتی ہو؟"

"میں نو بجے پہنچ جاتی ہوں اور تین بجے چلی جاتی ہوں۔ ہمارے لئے ایک گاڑی مخصوص ہے۔ ہم اسی میں شہر سے آتے جاتے ہیں۔"

"تت تم.......... تم کھڑی کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔"

اس نے محسوس کیا کہ وہ گھبرا رہا ہے۔ ہکلا رہا ہے۔ وہ آگے بڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے سوچا۔ تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہونی چاہئیں' رفتہ رفتہ حوصلہ پیدا ہوگا۔ یہ سوچ کر اس نے کہا۔ "تمہاری مادام نے مجھ سے کئی بار کہا کہ میں اس آخری اسٹیشن کے سلسلے میں دلچسپی لوں لیکن کاروباری مصروفیات بہت زیادہ ہیں۔ اس لئے ادھر پہلی بار آیا ہوں اور پہلی بار آکر پتہ چلا کہ یہ ماحول کتنا خوبصورت ہے۔"

ایسا کہتے وقت اس نے جھجکتے ہوئے اس کے حسین چہرے کو دیکھا' صرف خوابوں کی نہیں خیالوں کی بھی تعبیر ہوتی ہے۔ وہ خیالوں میں یوں آتی رہی تھی جیسے سچ مچ آگئی ہو۔ کیا اس وقت بھی وہ سچ مچ آگئی تھی۔ ظلِ سبحانی نے کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے سوچا' چھو کر دیکھنا چاہئے تب ہی یقین آئے گا۔ اگر تصور ہوگی تو گم ہو جائے گی۔

اس نے پھر نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ "تمہاری مادام شادی سے پہلے بالکل تمہاری جیسی تھیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "سر! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ بالکل میری طرح نہیں ہو سکتیں۔ کچھ تو فرق ہوگا۔"

"یقیناً فرق ہوگا لیکن تمہاری مادام سے شادی ہوئے تقریباً بیالیس برس گزر چکے ہیں۔ اتنی مدت میں چہرے دھندلا جاتے ہیں۔ وہ جوانی میں کیسی تھیں اچھی طرح یاد نہیں ہے۔ ایک ادھورا سا خاکہ ہے اور وہ خاکہ تمہیں دیکھنے سے مکمل ہو رہا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی کرسی سے اٹھ گیا۔ اس کے گھٹنے کانپ رہے تھے۔ پھر بھی وہ میز کا سہارا لیتے ہوئے زُبا کے قریب پہنچ گیا اس کے پاس والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے' گہری



گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ "میں ذرا قریب سے تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔"

"نہیں' سر! آپ تو بہت اچھے ہیں۔ مادام نے مجھے یہاں ملازم رکھتے وقت کہا تھا کہ آخری اسٹیشن کا کوئی بھی شخص میرے قریب آنا چاہے تو میں اس کے ساتھ محبت سے پیش آؤں۔"

"تم خیال ہو یا حقیقت میں تمہیں چھو کر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"آپ مجھے چھونے کا بہانہ نہ ڈھونڈیئے۔ یہ لیجئے میرا ہاتھ تھام لیجئے۔"

اس کا گورا گورا' گلابی گلابی ہاتھ اس کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ وہ ایک دم سے گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ جیسے دم نکلنے والا ہو' وہ پھول سا نازک مکھڑا' تازہ بہ تازہ بہار آفریں ہاتھ' بڑھاپے سے مصافحہ کرنے آیا تھا۔ اپنی اپنی سوچ اور اپنا اپنا نظریہ ہوتا ہے۔ وہ ہاتھ محبت کا پیغام لایا تھا اور ظلِ سبحانی سمجھ رہا تھا کہ جوانی پنجہ لڑانے آئی ہے۔ وہ کھانسنے لگا۔ کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔

زُبا نے کہا۔ "مادام نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ جوانی میں لوگ جتنا بھی غرور کریں۔ آخری اسٹیشن تک پہنچتے وہ بے چارے ہو جاتے ہیں۔ عبرت کی تصویر نظر آتے ہیں۔ ان سے ڈرنا نہیں چاہئے بلکہ ان سے ہمدردی کرنا چاہئے' میری تمام ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں سر! لیجئے میرا ہاتھ پکڑ لیجئے۔"

زُبا نے خود ہی اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر ظلِ سبحانی کے ہاتھ کو تھام لیا۔ وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ قریب آئی اس نے ایک ہاتھ سے ظلِ سبحانی کے سر کو سہلایا۔ پھر جھک کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور آہستگی سے بولی۔ "سر! محبت معصوم بھی تو ہوتی ہے۔"

☆======☆======☆

گھر کے تمام افراد رات کو نو بجے تک بڑے میاں اور بڑی بی کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ پھر بھوک سے پریشان ہو کر کھانے کے لئے میز کے اطراف بیٹھ گئے۔ ان میں بانو بے مثال نہیں تھی' جمال سبحانی کی بیوی نے کہا۔ "آج بانو کو پر لگ گئے ہیں۔ صابری کے ساتھ اُڑی اُڑی پھر رہی ہے۔"

راحت سبحانی نے کہا۔ "اس وصیت سے بانو اور صابری کو خاصا فائدہ پہنچے گا مگر

ہمیں کیا ملے گا۔ وہی تین ہزار روپے وہ بھی بحیثیت ملازم۔ کیا ہم اپنے والدین کی اولاد نہیں ہیں؟ کیا والدین کی دولت اور جائیداد میں ہمارا ذرا بھی حصہ نہیں ہے؟"

راحیل نے کہا۔ "ڈیڈی! میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں' دادی جان چاہتی ہیں کہ آپ اور تایا ابو محنتی بنیں اور اس ٹیکسٹائل ملز میں کوئی خاص کارکردگی کا مظاہرہ کریں۔"

"یو شٹ اپ۔ بڑوں کے بیچ میں نہ بولو۔"

بلی نے کہا۔ "انکل! جب ہم دادا جان اور دادی جان کے سامنے بڑھ بڑھ کر بولتے ہیں تو آپ لوگ بہت خوش ہوتے ہیں اور فخر سے کہتے ہیں کہ ہماری نئی نسل بہت اسمارٹ اور اسٹریٹ فارورڈ ہے اور جب آپ لوگوں کے معاملات میں بولتے ہیں تو ہمیں خاموش رہنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ یہ دوہری پالیسی کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔"

اس کی ماں نے کہا۔ "پلیز بلی! اپنے والدین کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھو تب تمہاری سمجھ میں آئے گا کہ دادی جان ہم سے کس طرح ناانصافی کر رہی ہیں۔"

"نہیں ممی! دادی جان چاہتی ہیں کہ پاپا اور انکل محنت کریں۔ ہمیشہ فارم پر رہیں اور ایسا ہونا چاہئے' رہ گئی یہ بات کہ ناانصافی کی گئی ہے تو دولت اور جائیداد کی تقسیم کا فیصلہ دادا جان پر ہے۔ ہم نے اس فیصلے پر غور کرنے کے لئے کہا تو انہوں نے ہماری بات مان لی۔ یہ دادا جان کا بڑا پن ہے۔"

"بیٹے! اگر تمہیں بڑے میاں پر اتنا ہی ناز ہے تو.........."

بلی نے بات کاٹ کر کہا۔ "پاپا! مداخلت کی معافی چاہتی ہوں۔ آپ دادا جان کو بڑے میاں نہ کہیں۔"

"کیوں؟ کیا وہ بوڑھے نہیں ہیں؟"

"بے شک بوڑھوں کو بڑے میاں کہا جاسکتا ہے لیکن آپ منہ پر ابا جان کہتے ہیں۔ اس لئے پیٹھ پیچھے بڑے میاں کہیں گے تو یہ احترام نہیں ہوگا۔ اس اندازِ تخاطب سے تضحیک کا پہلو نکلتا ہے۔"

راحت سجانی نے جھنجلا کر کہا۔ "یہ تم لوگوں نے کیا فضول بحث چھیڑ دی ہے؟ ہمیں اپنی بات تو کر لینے دو۔"

راحیل اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "کم آن بلی' ہم کسی اوپن ا



ریستوران میں کھائیں گے اور ٹھنڈی بوتلیں پئیں گے۔"

بلی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ جمال سجانی نے کہا۔ "ٹھہرو بیٹا! اس طرح نہ جاؤ۔ میں ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"پاپا! آپ لوگوں کی ضروری باتیں صرف دادا جان کی دولت تک محدود ہیں۔"

اس کی ماں نے کہا۔ "ہم وہ دولت حاصل کرکے اپنے ساتھ قبر میں لے جائیں گے۔ بے وقوف لڑکی' اتنا تو سوچ۔ ہم تمہارے اور راحیل کے لئے ہی سوچتے ہیں۔"

راحت سجانی نے کہا۔ "دیکھو بیٹے! جس طرح آج تم لوگوں نے دادا جان سے فائل چھین کر انہیں اپنی طرف جھکالیا ہے اسی طرح ان سے یہ معلوم کرلو کہ لاکر والی وصیت میں کیا لکھا ہے۔ ٹیکسٹائل ملز کس کے نام ہے۔ اس کی ساری آمدنی کس کے لئے وقف کی جارہی ہے۔"

"آج میں نے اور راحیل نے تمام دن ڈرائیونگ کی ہے۔ جہاں تک ہماری عقل جاتی رہی' ہم انہیں تلاش کرتے رہے۔ آپ ہمیں بتائیں کہ ہم کیا کریں۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ ہم باہر جاتے ہیں' آؤٹنگ کرتے ہیں۔ کہیں ٹھنڈی بوتلیں پیتے ہیں' اپنے آپ کو بہلاتے ہیں' پھر بھی انہیں بھلا نہیں سکتے۔"

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ دونوں ضرور واپس آئیں گے۔"

"ایک بات بتا دیجئے۔ اگر آپ لوگوں میں سے کوئی گھر سے غائب ہوجائے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ آپ لوگوں کو تلاش کرنا چاہئے یا آپ لوگوں کی جمع پونجی کا حساب کرنا چاہئے۔"

راحیل نے کہا۔ "اور ہم جانتے ہیں' بلی کے اس سوال کا جواب آپ لوگوں کے پاس نہیں ہوگا۔"

یہ کہتے ہی دونوں نے اپنے اپنے نیپکن' پلیٹ پر پھینکے اور وہاں سے گھوم کر تیزی سے چلتے ہوئے ڈائننگ روم سے باہر چلے گئے۔ راحت سجانی نے کہا۔ "نادان ہیں' جذباتی ہیں' ہم بھی اس عمر میں ایسے ہی تھے۔ ہمیں اپنے موضوع پر واپس آنا چاہئے۔ میں سوچ رہا ہوں۔ اگر امی کو کچھ ہوگیا اور وہ واپس نہ آسکیں تو ابا جان کو کس طرح ہینڈل کیا جائے۔ ہم کس طرح اپنے حقوق کے مطابق ان سے وصیت نامہ لکھوا سکتے ہیں۔"

جمال سبحانی نے کہا۔ "ابا جان کی فکر نہیں ہے۔ امی نہیں رہیں گی تو ہم بڑی آسانی سے انہیں ہینڈل کرلیں گے۔ اس سلسلے میں ببلی اور راحیل کو کام میں لائیں گے۔ اصل مسئلہ تو امی ہیں۔"

اس کی بیوی نے کہا۔ "توبہ' توبہ' ایسی ماں تو میں نے کہیں نہیں دیکھی' سگے بیٹوں سے سوتیلوں جیسا سلوک کررہی ہیں۔"

"امی کی برائی کرنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ کوئی تدبیر سوچو۔"

بڑی بہو نے کہا۔ "ادھر ہم سوچیں گے ادھر امی واپس آجائیں گی۔ ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔"

چھوٹی بہو نے کہا۔ "میں تو صاف کہتی ہوں۔ برا لگے یا بھلا ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ امی واپس نہ آئیں۔ ہم ابا جان کو سنبھال لیں گے۔"

راحت سبحانی نے غصہ دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بکواس کررہی ہو۔ کیا ہم امی کے مرنے کی دعائیں مانگیں؟"

"دعا سے کوئی نہیں مرتا۔ دوا سے مرتا ہے۔ آپ کی مرضی ہے' میرا تین ہزار میں گزارا نہیں ہوگا۔ میں میکے چلی جاؤں گی۔"

سب خاموش ہوگئے۔ سر جھکا کر کھانے لگے' مگر سب کے دماغوں میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ چھوٹی بہو نے جو کہا تھا وہ بات دماغ میں چبھ رہی تھی۔ "امی کو واپس نہیں آنا چاہئے امی کو واپس نہیں آنا چاہئے۔"

اچانک ہی ڈرائنگ روم سے فون کی گھنٹی سنائی دی۔ وہ سب کھاتے کھاتے یوں چونک گئے جیسے کوئی زبردست دھماکہ ہوا ہو یا بڑی ہی خطرے کی گھنٹی بجاتی ہوئی پہنچ گئی ہوں۔ وہ سب کے سب ایک ساتھ اپنی کرسیوں سے اٹھے۔ کھانا چھوڑ دیا۔ تیزی سے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے۔ راحت سبحانی نے لپک کر ریسیور اٹھایا' پھر جلدی سے کہا۔ "جی فرمائیے؟"

دوسری طرف سے کسی کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ہم ظلِ سبحانی سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"میں ان کا چھوٹا بیٹا راحت سبحانی ہوں۔ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ آپ ان سے کیا کہ چاہتے ہیں؟"



دوسری طرف سے کہا گیا۔ "ہولڈ آن کرو۔"

وہ انتظار کرنے لگا۔ جمال سبحانی اور ان کی بیویاں قریب آگئیں۔ سبھی پوچھنے لگے۔ "کون ہے؟ کس کا فون ہے؟"

راحت سبحانی نے کہا۔ "کوئی شخص ہے نام نہیں بتایا۔ مجھے ہولڈ آن کرنے کے لئے کہا ہے۔ ابا جان کو پوچھ رہا تھا۔"

اسی وقت فون پر آواز سنائی دی۔ "کیا ظلِ سبحانی کے بڑے صاحبزادے جمال سبحانی موجود ہیں۔ اگر ہیں تو ریسیور انہیں دو۔"

راحت سبحانی نے بڑے بھائی کو ریسیور دیتے ہوئے کہا۔ "کوئی آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

جمال سبحانی نے ریسیور لے کر کان سے لگایا پھر کہا۔ "میں جمال سبحانی بول رہا ہوں' فرمائیے؟"

سب نے قریب آکر جمال سبحانی کے کان کے قریب اپنے کان لگادیئے۔ ریسیور سے آنے والی آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگے۔ دوسری طرف سے آواز آرہی تھی۔ "ہم جو کوئی بھی ہیں' تم نہیں جانتے۔ کیا اتنا کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ تمہاری ماں ہمارے قبضے میں ہے۔ اگر اس کی زندگی چاہتے ہو تو پولیس سے رابطہ قائم نہ کرنا ورنہ کل صبح اس کی لاش ملے گی۔"

جمال نے کہا۔ "نہیں' نہیں ہم پولیس سے رابطہ قائم نہیں کریں گے۔ کسی کو نہیں بتائیں گے۔ تم کیا چاہتے ہو؟ کہاں ہو؟ ہماری والدہ کو تم نے کہاں رکھا ہے؟"

"کیوں نادان بچوں جیسا سوال کررہے ہو۔ کیا ہم تمہیں بتادیں گے' ہرگز نہیں۔ ہماری دوسری شرط یہ ہے کہ جہاں ہم کہیں وہاں دس ہزار روپے لے کر پہنچ جاؤ۔ ہم کوئی عذر نہیں سنیں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم لوگ دولت مند ہو۔"

جمال سبحانی نے ریسیور کان سے لگائے کن اکھیوں سے اپنی بیگم اور بھائی وغیرہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی بہت ہی پُراسرار انداز میں آنکھیں پھیلائے جمال سبحانی کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے جلد ہی کسی خاص نتیجے تک پہنچنا چاہتے ہوں۔"

جمال سبحانی نے کہا۔ "ہم بے شک دولت مند ہیں۔ تمہارا مطالبہ بھی پورا کردیں گے لیکن میں پہلے امی کی آواز سننا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہونا چاہئے کہ وہ تمہارے پاس

ہیں اور بخیریت ہیں۔"

"تم ابھی ان کی آواز سنو گے۔ اس سے پہلے ہم پھر وارننگ دیتے ہیں اگر کوئی چالاکی دکھاؤ گے یا ہمیں کسی طرح پولیس کے ذریعے گھیرنے یا گرفتار کرانے کی کوشش کرو گے تو............"

"بار بار وارننگ نہ دو۔ ہمیں اپنی والدہ کی زندگی عزیز ہے۔ ہم انہیں زندہ سلامت واپس حاصل کرنے کے لئے تمہاری تمام شرائط منظور کرلیں گے۔ پہلے آواز سناؤ۔"

تھوڑی دیر بعد رُبابہ خاتون کی آواز سنائی دی۔ "بیٹے جمال! میں تمہاری ماں ہوں۔ ان بدمعاشوں نے مجھے پکڑ رکھا ہے۔ میں ان سے بار بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے چھوڑ دیں۔ ان کا جو بھی مطالبہ ہوگا۔ پورا کردوں گی لیکن یہ نہیں مانتے۔ پہلے رقم چاہتے ہیں تم ان کے بتائے ہوئے پتے پر فوراً دس ہزار روپے لے کر پہنچو۔"

"امی! آپ جو کچھ ساتھ لے گئی تھیں کیا وہ آپ کے پاس نہیں ہے؟ اگر نہیں ہے تو کہاں ہے؟"

"بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ اگر میرے پاس کچھ ہوتا تو میں دے دلا کر واپس آجاتی۔ میں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ جو کہہ رہی ہوں اس پر عمل کرو۔ اگر تمہارے پاس رقم نہیں ہے تو اپنے باپ سے لے لو۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ آپ ریسیور ان لوگوں کو دیجئے۔"

تھوڑی دیر بعد پھر وہی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ پتہ بتا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ دھمکی بھی دیتا جارہا تھا کہ جمال سبحانی کو بالکل تنہا آنا چاہئے۔ اگر کوئی ساتھ ہوگا تو بڑی بی زندہ واپس نہیں ملے گی۔ اس نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا۔ "میں دو گھنٹے کے اندر رقم لے کر اس جگہ پہنچ رہا ہوں۔ مگر تمہارے ساتھ میری امی کو ہونا چاہئے۔ انہیں دیکھنے کے بعد ہی میں رقم ادا کروں گا۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "ہم تمہاری ماں کو اپنے ساتھ نہیں لائیں گے۔ پتہ نہیں وہاں کیا سچویشن ہوگی۔ رقم تم سے لیں گے اور صبح سے پہلے انہیں آزاد کردیں گے۔ منظور ہے تو آؤ ورنہ جہنم میں جاؤ۔"

"میں آرہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔



اس کی بیگم نے پوچھا۔ "کیا آپ رقم لے کر وہاں جائیں گے؟ اکیلے جائیں گے؟ نہیں، میں نہیں جانے دوں گی۔ آپ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"مجھے جانا ہی ہوگا۔ امّی کی زندگی خطرے میں ہے۔"

راحت سبحانی نے کہا۔ "مگر دس ہزار روپے ہمارے پاس کہاں ہیں؟ کیا آپ کے پاس ہیں؟"

"شکر کرو' وہ کمبخت یہ نہیں جانتے کہ ہم کروڑ پتی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ دس ہزار میں معاملہ ٹل رہا ہے۔ میرے پاس پانچ ہزار ہیں۔ تمہارے پاس کتنے ہیں؟"

اس نے بیوی کو دیکھ کر پوچھا۔ "کیوں بیگم! تین ہزار تک نکل آئیں گے؟"

"آٹھ ہزار ہوگئے۔ باقی دو ہزار کی کمی ہماری بیگمات پوری کردیں گی۔"

دونوں بیگمات انکار کرنے لگیں۔ کہنے لگیں' ان کے پاس نقد رقم نہیں ہے اور وہ اپنے زیورات نہیں دیں گی۔ جمال سبحانی کی بیگم نے کہا۔ "وہ پانچ ہزار روپے آپ نے اپنی بیمہ پالیسی کے لئے رکھے تھے۔ کیا اسے بھی ضائع کردیں گے۔ اس گھر سے تو مجھے پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی۔ کیا میں آپ کے بعد سڑکوں پر بھیک مانگتی پھروں گی؟"

راحت سبحانی نے کہا۔ "ہمیں کسی نہ کسی طرح امّی کو واپس لانا ہوگا۔"

اس کی بیگم نے کہا۔ "واپس کیوں لانا ہوگا۔ کیا ہم پولیس کو اطلاع نہیں دے سکتے؟ اگر ہم مجرموں کی بات مان لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جرائم پیشہ لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ہمیں قانون کا ساتھ دینا چاہئے اور قانون کی مدد لینی چاہئے۔"

"تمہاری بات معقول ہے۔ ہم پُرامن شہری ہیں اور ہمیں ہر معاملے میں قانون کا سہارا لینا چاہئے۔"

جمال سبحانی نے کہا۔ "کیا کہہ رہے ہو۔ اگر مجرموں نے پولیس والوں کو دیکھ لیا تو امی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

اس کی بیگم نے کہا۔ "آپ تو خواہ مخواہ ڈرتے ہیں۔ پولیس والے ہاتھوں میں چوڑیاں تو نہیں پہنے ہوئے ہیں۔ وہ مجرموں کا مقابلہ کریں گے اور ان سے امّی کو چھڑا کر واپس لے آئیں گے۔"

ایسا کہتے ہی بیگم نے اپنے میاں کو آنکھیں دکھائیں۔ صاف اشارہ تھا کہ بات کو

سمجھنے کی کوشش کرو یعنی واپس لانے کی کارروائی بھی کرو، اور بڑی بی کے واپس نہ آنے کا جواز بھی پیدا کرو۔

جمال سبحانی ایک گہری سانس لے کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "میرے دماغ میں ایک اور تدبیر پک رہی ہے۔ میں امی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ انہیں واپس تو لاؤں گا لیکن وہ اسی وقت آئیں گی جب ہم چاہیں گے۔"

سب نے ایک ساتھ پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

"میں ابھی دس ہزار روپے لے کر ان کے پاس جاؤں گا اور ان سے ایک سودا کروں گا۔ وہ یہ کہ میں ہر ماہ انہیں دس ہزار روپے دوں گا اور وہ امی کو بحفاظت اپنے پاس رکھیں گے۔ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ ادھر ہم لاکر والی وصیت کو نکلوانے کی کوشش کریں گے۔ اسے دیکھیں گے سنیں گے۔ اگر وہ ہمارے مفاد کے خلاف ہوگی تو ہم ابا جان سے دوسری وصیت لکھوائیں گے۔ جب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے تو مجرموں کو آخری بار رقم دے کر امی کو لے آئیں گے۔"

راحت سبحانی کی بیگم نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "واہ بھائی صاحب کیسی تدبیر سوچ رہے ہیں۔ امی جب بھی واپس آئیں گی تو یہی کہیں گی کہ ہم نے دس ہزار روپے دے کر انہیں مجرموں سے نجات نہیں دلائی تھی۔"

جمال سبحانی نے کہا۔ "میں کچھ سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ ہم جواب میں یہی کہیں گے کہ ہم نے دس ہزار روپے دیئے تھے اور وہ رقم لے کر ہر بار مکر جاتے تھے اور مزید رقم کا مطالبہ کرتے رہتے تھے۔"

"امی یہ بھی سوچیں گی کہ ہم نے ابا جان سے بانو اور صابری سے اس بات کا ذکر کیوں نہیں کیا؟"

"مجرموں نے ہمیں دھمکی دی تھی اور کہا تھا کہ ہم کسی سے اس سلسلے میں بات کریں گے تو وہ امی کو گولی مار دیں گے۔ ہم نے امی کی سلامتی کی خاطر خاموشی اختیار کی تھی۔ ہم وقت آنے پر اور بھی طرح طرح کے بہانے تراش لیں گے۔ فی الحال ہمیں یہی کرنا ہے اور امی کو یہاں سے دور رکھنا ہے۔ اسی میں ہماری کامیابی ہے۔"

"لیکن بھائی جان! جب تک ابا جان امی کا انتظار کرتے رہیں گے جب تک انہیں



امی کے زندہ رہنے اور واپس آنے کی توقع رہے گی اس وقت تک وہ وصیت نامے میں تبدیلی نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہماری امی کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے لیکن ہماری کامیابی اسی میں ہے کہ کسی طرح امی کی موت کی تصدیق ہو جائے۔"

سب راحت سبحانی کا منہ تکنے لگے۔ جیسے پوچھ رہے ہوں، تمہارے دل میں کیا ہے؟

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ امی کو کچھ ہو جائے۔ میں تو بس یونہی جھوٹ موٹ کی تصدیق چاہتا ہوں۔ اس سے کام بن جائے گا۔"

سب نے سر جھکا لئے۔ اپنے اپنے طور پر سوچنے لگے۔ بڑی مجبوری تھی۔ سب کے سامنے پرانے رشتوں کی موت کی دعائیں مانگی نہیں جاسکتیں اور دل میں جو دعا چھپی ہوتی ہے وہ آسمان تک نہیں پہنچتی۔ بوڑھے سینے پر مونگ دلنے کے لئے زندہ رہتے ہیں۔ بہت ہی لمبی بڈھی عمر گزارنے کے بعد تڑپا تڑپا کر مرتے ہیں۔

جمال سبحانی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "اللہ کا شکر ہے کہ ہم شریف لوگ ہیں یا شاید بزدل، قتل کرنا نہیں جانتے۔ اپنے محترم رشتوں کو مارنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ ہم تو بس اتنا چاہتے ہیں کہ وہ کچھ عرصے تک واپس نہ آئیں اور اس کا وہی راستہ ہے جو میں کہہ چکا ہوں۔ چلو اپنے اپنے پاس سے رقم نکالو۔ دس ہزار پورے کرو۔"

☆======☆======☆

ظلِ سبحانی کا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔ دلربا نے فوراً ہی ڈاکٹروں کو وہاں طلب کیا تھا۔ پھر اسے طبی امداد پہنچائی گئی۔ اس کے بعد اسے آخری اسٹیشن کے ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک ڈاکٹر کبھی کبھی آکر اٹینڈ کرتے رہے۔ نرسیں آتی رہیں، دوائیں پلاتی رہیں اور انجکشن لگاتی رہیں۔ اس بوڑھے ہسپتال میں نرسیں جوان تھیں۔

ایک زمانے سے یہ دستور چلا آرہا تھا ڈاکٹر اور دوسرے طبی شعبوں کے ماہرین کچھ سوچ سمجھ کر ہی جوان لڑکیوں اور عورتوں کو نرس کی ڈیوٹی پر مامور کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ دنیا کا کیسا ہی مرض ہو، مرد ہو پہلے وہ جوانی کے سامنے ہتھیار ڈالتا ہے اس کے بعد دواؤں سے جاتا ہے۔ ظلِ سبحانی کے سامنے کسی نرس کا ہونا یا نہ ہونا برابر

تھا۔ کیونکہ دلربا اس کے پاس تھی۔

جب ڈاکٹر مطمئن ہو گئے کہ طبیعت سنبھل گئی ہے تو انہوں نے ظلِ سبحانی کو آرام سے لیٹے رہنے کا مشورہ دیا پھر اس کمرے سے چلے گئے۔ وہ اسپیشل وارڈ کا اسپیشل کمرہ تھا۔ اس کمرے کی محدود فضا میں صرف دلربا اس کے ساتھ تھی۔ اس نے کہا۔ "رُبا! تم سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن تم میری مصیبت میں ساتھ دے رہی ہو۔ یہ دیکھ کر مجھے جتنی خوشی ہو رہی ہے اسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔"

"آپ زیادہ باتیں نہ کریں۔ آپ آرام سے لیٹے رہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ میں نہیں بولوں گا' تم کچھ بولو۔"

"میں کیا بولوں؟ آپ مجھ سے زیادہ سمجھدار ہیں۔ جوانی' جسمانی قوت کا نام نہیں بلکہ قوتِ برداشت کا نام ہے۔ اگر آپ مجھے پالینے کے جذبوں اور مسرتوں کو برداشت کر لیتے تو اس وقت ایک بوڑھے کی طرح ایک بستر پر پڑے نہ رہتے۔"

ظلِ سبحانی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "ہاں' چاروں شانے چت ہونے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ شکست کیسے کھائی ہے۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ جوانی میں جو جذبہ ہوس کہلاتا ہے' وہ بڑھاپے میں حسرت ہے۔ ہمیں حسرتوں کے پیچھے یوں آنکھیں بند کر کے نہیں دوڑنا چاہئے بلکہ نارمل رہنا چاہئے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میری دوستی بالکل نارمل ہو گی' بالکل معصوم ہو گی۔ کیا تم مجھ سے دوستی کرو گی؟"

رُبا نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر اس کے ایک ہاتھ کو تھام لیا۔ اس کے ہاتھ کو ہولے ہولے سہلا کر بولی۔ "یہ حقیقت اٹل ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ بڑھاپے میں جو دوستی ہوتی ہے وہ بے لوث ہوتی ہے۔ آپ عاقبت اندیش ہوں' نہ ہوں' مجھے کوئی اندیشہ نہیں رہے گا۔"

چند لمحوں تک ظلِ سبحانی کی نظریں جھکی رہیں' پھر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بالکل ہی اٹھارہ برس والی رُبا لگ رہی تھی۔ بیالیس برس پہلے کی دھندلائی ہوئی صورت پر اب دلربا کی صورت آ گئی تھی۔ اس لئے وہ ماضی کی رُبا لگ رہی تھی بلکہ ماضی کی رُبا سے زیادہ پُرکشش تھی۔ اگر وہ اسی طرح ساتھ رہے تو رہی سہی عمر میں بہار آ جائے۔ پھل پکنے لگیں' پھول کھلنے لگیں۔ رُبا ہو تو رنگ ہو' نور ہو' خوشبو ہو نظارہ ہی نظارہ ہو۔ دور ہی سے ہو مگر آخری موسم میں بہار تو آ جائے گی۔



جہاں محبت ہوتی ہے وہاں رقابت بھی ہوتی ہے۔ ظلِ سبحانی نے اچانک ہی دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم.......... تم کیوں آ گئے؟"

رفیق نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "ربا! تم نے تین بجے تک مجھ سے ملاقات کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں عمارت کے باہر انتظار کرتا رہا۔ جو گاڑی تم لوگوں کو شہر لے آتی اور لے جاتی ہے وہ بھی جا چکی ہے۔"

ظلِ سبحانی نے اپنے رقیب کو جلانے کے لئے کہا۔ "تم تین بجے کے بعد بھی میرا ساتھ دے رہی ہو؟ اگر اسی طرح ساتھ دیتی رہو تو ہماری دوستی اور محبت پائیدار ہو گی رہے گی۔"

رفیق نے مایوس ہو کر رُبا کی طرف دیکھا' وہ بولی۔ "ان کی طبیعت اچانک ہی بگڑ گئی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے وعدے کے مطابق تم سے ملاقات نہ کر سکی۔"

رفیق نے خوش ہو کر کہا۔ "میرے لئے اتنا ہی بہت ہے کہ تم نے مجھے یاد رکھا ہے۔"

ایسا کہتے ہوئے وہ کن انکھیوں سے ظلِ سبحانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ظلِ سبحانی نے غصے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "چلے جاؤ یہاں سے۔ میرے کمرے سے نکل جاؤ۔"

ربا نے اٹھ کر ظلِ سبحانی کو تھپکتے ہوئے' دوبارہ لٹاتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے میں پہلے کہہ چکی ہوں۔ قوتِ برداشت کا نام ہی جوانی ہے۔ آپ اپنے اوپر بڑھاپے کا الزام نہ لیں۔ رفیق صاحب سے مسکرا کر باتیں کریں۔"

وہ چپ رہا۔ پہلے تو اس نے غصے سے اپنے رقیب کو دیکھا پھر رُبا کو دیکھنے لگا تاکہ غصہ ٹھنڈا ہوتا رہے' پھر اس نے کہا۔ "جو بات مجھے سمجھا رہی ہو وہ رفیق کو بھی سمجھاؤ۔"

"میں آپ دونوں کو سمجھا رہی ہوں۔ رفیق صاحب یہاں بیٹھ جائیں۔ یہ میرے سر ہیں۔ ان سے اچھی باتیں کریں۔"

ظلِ سبحانی نے پوچھا۔ "میرا ڈرائیور کہاں ہے؟"

"وہ باہر بیٹھا ہے۔"

ڈرائیور کو بلایا گیا۔ ظلِ سبحانی نے کہا۔ "مس رُبا کو ان کے گھر پہنچا دو اور ان کا گھر اچھی طرح دیکھ لو۔ روز صبح انہیں میری گاڑی میں لے کر آؤ گے اور ڈیوٹی ختم

ہونے کے بعد پہنچاؤ گے۔"

"سر! آپ اتنی تکلیف کیوں کر رہے ہیں۔ میں کسی طرح چلی جاؤں گی۔"

"دوستی کا تقاضا ہے کہ دوست کے کام آیا جائے۔ میں تمہارے آرام اور سہولت کے لئے اور بھی انتظامات کروں گا۔ تم جاسکتی ہو۔ تمہارے گھر والے پریشان ہوں گے۔"

وہ شکریہ ادا کرکے جانے لگی۔ رفیق اس کے ساتھ جانے کے لئے اٹھ گیا۔ ظلِ سبحانی نے کہا۔ "ربا! تم نے ابھی کہا تھا کہ رفیق میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا رہے گا۔"

اس نے کہا۔ "ہاں رفیق صاحب! آپ ان سے باتیں کریں ان کا دل بہلتا رہے گا۔ کل پھر ملاقات ہوگی۔"

وہ ڈرائیور کے ساتھ چلی گئی۔ رفیق غصے سے ظلِ سبحانی کو دیکھنے لگا۔ وہ مسکرارہا تھا۔ ڈرائیور نے واپس آکر پوچھا۔ "حضور! کیا میں گھر میں آپ کی علالت کی اطلاع دے دوں؟"

"نہیں، تم انہیں گھر چھوڑ کر گاڑی یہاں لے آؤ۔"

وہ چلا گیا۔ رفیق نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہم خواہ مخواہ ایک دوسرے سے جلتے ہیں اور حسد کرتے ہیں۔ ایک پھول کھلتا ہے تو سب کے لئے کھلتا ہے۔ سبھی اسے دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی خوشبو ہمارے تمہارے پاس پہنچتی ہے لیکن تم دولت مند لوگ چاہتے ہو کہ دنیا کی ہر چیز خرید کر اپنی ملکیت بنالو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ کم از کم اس آخری عمر میں تو انصاف کرو۔"

"کیا یہ انصاف کم ہے کہ میری بیوی نے تمہیں یہاں پہنچا دیا۔ یہاں تم آرام سے رہو گے۔ کسی کی محتاجی نہیں ہوگی، تمہارے بیٹے اور تمہاری بیوی تمہیں بوجھ نہیں سمجھیں گے۔"

"ہاں، یہ بہت اچھی جگہ ہے۔ میں اپنی عمر کے چند سال یہاں بڑے آرام سے گزاروں گا۔"

"مجھے یہاں کے متعلق کچھ بتاؤ؟"

رفیق نے ایک کتابچہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس میں آخری اسٹیشن کے متعلق پوری معلومات ہیں، پڑھ لو۔"



ظلِ سبحانی نے اس کتابچے کو لے کر دیکھا۔ اوپر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ "دی لاسٹ اسٹیشن، آخری پڑاؤ۔" اس کے نیچے اس جگہ کا پتا اور نقشہ دیا گیا تھا جہاں آخری اسٹیشن کے نام سے ایک شہر آباد ہو رہا تھا۔

اس نے ورق الٹ کر دیکھا پہلے صفحے پر دیباچہ کے طور پر لکھا ہوا تھا۔ "ایک گھریا ایک پناہ گاہ ہر جاندار کے لئے لازمی ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی کمتر جاندار کیوں نہ ہو۔ حیوان کم عقل سمجھا جاتا ہے۔ انسان سب سے زیادہ عقلمند ہے اور سب سے زیادہ احمق ہے کیونکہ وہ ساری عمر محنت کرتے رہنے کے باوجود اپنا آخری ٹھکانہ نہیں بناتا۔ یہی سمجھتا ہے کہ آخری ٹھکانہ قبر ہے اور وہاں جاکر سو جانا ہے لیکن وہ قبر تک کیسے پہنچے گا۔ عزت سے احترام سے یا چندے کے کفن دفن سے؟

انسان جو تمام عمر فخر سے سینہ تان کر چلتا ہے، آخری عمر میں گردن جھکانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ایسا محض اس لئے ہوتا ہے کہ وہ بڑھاپے میں جوان اولاد کے رحم وکرم پر ہوتا ہے۔ اولاد ان کے رحم وکرم پر ہو تو انہیں اچھی تعلیم ملتی ہے۔ اچھا کھانا ملتا ہے۔ اس کے مستقبل کو سنوارا جاتا ہے اور یہی مستقبل کو سنوارنے والے جب اولاد کے محتاج ہوتے ہیں تو انہیں توقع کے خلاف اپنے بچوں سے طوطا چشمی ملتی ہے۔

ہر بچہ بے مروت نہیں ہوتا۔ کچھ اس کی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ وہ مشینی دور میں اپنے بوڑھوں کی طرف توجہ نہیں دے سکتا۔ اپنی کمائی کی فکر میں اپنی بیوی اور اپنے بچوں کے مستقبل کو سنوارنے کی لگن میں پیچھے مڑ کر اپنے بوڑھوں کا ہاتھ مضبوطی سے نہیں تھام سکتا۔

انسانی رشتوں کے سیلاب میں جب پار لگنے کا وقت آتا ہے تو ایک جوان مرد، ایک ذمہ دار شخص کو سوچنا پڑتا ہے کہ وہ کس کا ہاتھ تھام لے اور کس کا ہاتھ چھوڑ دے۔ پہلے کسے اپنے ساتھ لے کر پار اترے؟ ایسے میں سب سے پہلے اس کے ہاتھوں میں بیوی اور بچوں کا ہاتھ آتا ہے۔ بوڑھے اس فیصلے کے دوران سیلاب کی زد میں بہہ کر دور نکل جاتے ہیں۔ گویا جوان اولاد سے دانستہ یا نادانستہ بے مروتی سرزد ہوتی ہے۔

ہم کسی کو الزام نہیں دینا چاہتے۔ ہاں الزام انسانی عقل پر ہے کہ ابتدائے

تہذیب سے لے کر اب تک انسانوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ زمین سے لے کر چاند' ستاروں تک اپنی ذہانت کا سکہ بٹھا دیا لیکن بوڑھوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

یہ ازل سے دیکھا جارہا ہے کہ بوڑھے بوجھ بن جاتے ہیں' ان کی بیماریاں ناقابل برداشت ہوتی ہیں۔ گھر کی بہوئیں انہیں ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتیں۔ بچے ان کے بڑھاپے کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان بوڑھوں کو محض اس لئے برداشت کیا جاتا ہے کہ دنیا کی شرم آڑے آتی ہے۔ انہیں گھر سے نکالا نہیں جاسکتا۔ مجبوراً گھر کے اسٹور روم میں یا پچھلے برآمدے میں انہیں پرانے سامان کی طرح رکھ دیا جاتا ہے۔

مجبوری یہ بھی ہے کہ ہر شخص اپنے بوڑھوں کے لئے ایک الگ گھر نہیں بنا سکتا۔ ایسا ہم نے سوچا ہے۔ ہم نے حکومت سے اپیل کی ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہمارے ساتھ تعاون کرے۔ بڑے بڑے کروڑ پتی اور ارب پتی سرمایہ دار اس سلسلے میں ہمارا ساتھ دے رہے ہیں اور ہم آخری پڑاؤ کے نام سے ایک بستی آباد کر رہے ہیں جو کئی میل کے فاصلے پر محیط ہوگی۔

اس بستی کا آغاز ہوچکا ہے۔ چھوٹے چھوٹے کوارٹروں کی تعمیر ہو رہی ہے۔ سب سے پہلے ایک بہت بڑا ہسپتال قائم کردیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں شہر کے نوجوان ڈاکٹروں' لیڈی ڈاکٹروں اور نرسوں سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ ہفتے میں صرف دو گھنٹے کے لئے آخری اسٹیشن کے ہسپتال میں آئیں۔ مریضوں کو دیکھیں' نسخے لکھیں۔ پھر ان نسخوں کے مطابق شہر سے آنے والے دوسرے ڈاکٹر' بوڑھے مریضوں کا علاج کریں گے۔

ہمیں یقین ہے کہ اتنے بڑے شہر کے ہزاروں ڈاکٹر انسانی ہمدردی کے تحت ہفتے میں صرف دو گھنٹے اپنے بوڑھوں کے لئے وقف کرسکتے ہیں اور بڑی خوش دلی سے ان کا علاج کرسکتے ہیں۔

اس ہسپتال کے سلسلے میں ملکی اور غیر ملکی دواساز کمپنیاں بھی تعاون کررہی ہیں۔ یہاں لیبارٹری' ایکسرے اور سرجری کے سلسلے میں تمام مشینیں اور ضروری آلات موجود ہیں۔

بوڑھوں کا اصل مسئلہ ہے محبت' وہ اس دنیا میں ایک طویل زندگی گزارنے کے



بعد چاہتے ہیں کہ دنیا انہیں چاہے۔ ان کی طرف توجہ دے' ان سے محبت کرے۔ اس عمر میں چاہے جانے کی تمنا سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہم نے اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ آخری پڑاؤ کے بوڑھے اور بوڑھیوں کے لئے ڈھیر ساری محبتوں کا انتظام کیا جائے۔ ہم نے شہر کے تمام طلبہ اور طالبات سے درخواست کی ہے کہ وہ ہفتے میں ایک بار یہاں آیا کریں اور ان بوڑھوں سے ملاقات کیا کریں۔ ان کی باتیں سنا کریں۔ ان سے محبت سے پیش آیا کریں۔ رضاکارانہ طور پر اسکاؤٹس بن کر انسانی فرض ادا کریں۔ ہمارے شہر کے کئی لاکھ طلبہ اور طالبات اگر ہفتے کا ایک ایک دن مقرر کرلیں تو یہاں ہر روز نوجوان بچوں کا میلہ لگا رہے گا' اور میلے میں بوڑھے اتنے خوش اتنے صحت مند رہیں گے کہ یہ آخری اسٹیشن دنیا والوں کے لئے مثال بن جائے گا۔ پھر رفتہ رفتہ دنیا کے ہر ملک میں' ہر شہر میں ایسی ہی ضمنی بستیاں قائم ہوتی جائیں گی۔ تب انسان اپنی آخری عمر میں محترم ہوگا اسے بڑھاپے کی ذلت نہیں' بزرگی کی عظمت حاصل ہوگی۔"

ظلِ سبحانی نے کتابچے کو بند کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک خواب لگتا ہے۔ اللہ کرے اس خواب کی تعبیر خاطر خواہ ہو' اور تمہارے جیسے غریب بوڑھوں کا بھلا ہوجائے۔"

رفیق نے پوچھا۔ "کیا تم بوڑھے نہیں ہو؟"

"ہمارے بڑھاپے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم دولت مند ہیں' ہمارے بچے ہمارے محتاج ہیں۔ ہم ان کے نہ تو محتاج ہیں' نہ رہیں گے۔"

"بڑا بول نہ بولو۔ جو دولت مند بوڑھے ہوتے ہیں وہی سب سے زیادہ مظلوم ہوتے ہیں۔ ان کی دولت انہیں کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی۔ ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ دولت کی خاطر جوان بچے اپنے والدین یا سرپرستوں کو قتل کردیتے ہیں۔"

ظلِ سبحانی نے کتاب کو ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "ہماری اولاد ایسی نہیں ہے ہم نے انہیں اعلیٰ تعلیم دی ہے اخلاق کا درس دیا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ایسا کبھی نہیں کریں گے۔"

رفیق نے جھک کر فرش پر سے کتابچے کو اٹھایا' پھر کہا۔ "میں تمہارے لئے دعا کروں گا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی اپنی ایک ایک اولاد کا چہرہ نظر آنے لگا۔ جمال سبحانی' راحت سبحانی' دونوں بہوئیں' بانو بے مثال' راحیل اور ببلی سبھی اس کے آس پاس آکر کھڑے ہوگئے تھے۔ سب جانے پہچانے تھے کون ہڈ حرام ہے' کون بیوی کے اشارے پر چلتا ہے۔ ایک بیٹی بانو بے مثال تھی۔ اس سے کوئی گلہ نہیں تھا کیونکہ وہ پرائے گھر جانے والی تھی۔ راحیل اور ببلی ابھی نادان تھے نادان نہ بھی ہوں تو دادا' دادی کے سامنے ان کی ہر خطا ہنس کر ٹالنے کے لئے ہوتی تھی۔

اس نے اپنی اولاد کے چہروں کو باری باری دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم میں سے کون مجھے سب سے زیادہ چاہتا ہے؟"

ان سبھی نے اپنے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہنا شروع کیا۔ "ہم چاہتے ہیں۔ دکھ' بیماری میں صرف اولاد ہی کام آتی ہے۔ ہم آپ کی خدمت کریں گے۔"

یہ کہتے ہوئے دونوں بیٹے بستر کے پائینتی آگئے اور بڑے میاں کے پاؤں دابنے لگے۔ دونوں بہوئیں سرہانے آگئیں۔ ایک نے ہاتھ دابنا شروع کیا' دوسری سر دبانے لگی۔ ببلی نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "راحیل دیکھو! کسی کے حصے میں ٹانگ ہے' کسی کے حصے میں ہاتھ ہے اور کسی کے حصے میں سر..........."

راحیل نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ "دولت سے پہلے دادا جان کو تقسیم کیا جا رہا ہے۔"

پھر ببلی نے راحیل کو ہاتھ سے پکڑ کر دروازے کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "چلو ہم کوئی مزیدار انگلش فلم دیکھیں گے۔"

وہ دونوں بچے چلے گئے۔ ظلِ سبحانی نے غصے سے اپنے بیٹے اور بہوؤں کی طرف دیکھا۔ "دیکھو! ان بچوں کو دیکھو! ان میں منافقت نہیں ہے۔ جو ان کے دل میں ہے زبان پر ہے اور جو تمہارے دل میں ہے وہ زبان پر کبھی نہیں آئے گا' نکل جاؤ یہاں سے' دفع ہو جاؤ۔"

پلک جھپکتے ہی وہ سب دفع ہوگئے۔ سامنے سے غائب ہوگئے۔ کمرہ خالی ہوگیا۔ پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کیسی تنہائی' کیسی ویرانی تھی۔ دل بہلانے کا کوئی سامان نہیں تھا مگر کیسے نہیں تھا۔ یہ سوچتے ہی پھر رُبا نگاہوں کے سامنے آگئی۔



وہ بہل گیا۔ ساڑھے سات بجے ایک نوجوان نرس رات کا کھانا لے کر آئی۔ اس نے خوش ہو کر کھانا کھایا۔ چہک چہک کر نرس سے باتیں کرتا رہا۔ پھر وہ چلی گئی۔ وہ کمرے میں اٹھ کر تھوڑی دیر ٹہلتا رہا۔ پھر بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے کمرے کی بتی بجھادی۔ اندھیرا کردیا' کیونکہ اندھیرے میں تصور کی دنیا اور روشن ہو جاتی ہے۔ رُبا کرن کرن جگمگاتی ہوئی اس کے پہلو میں آکر بیٹھ گئی۔

پھر اسے وقت گزرنے کا پتہ نہ چلا۔ آہستہ آہستہ آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ نیند کی آغوش میں جانے لگا۔ ایسے ہی وقت اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھوں کے سامنے تیز روشنی ہوئی پھر اندھیرا چھا گیا۔ کسی نے سوئچ آن کیا تھا پھر آف کر دیا تھا۔ روشنی کے بعد اندھیرا ہوا تو پہلے سے زیادہ تاریکی کا احساس ہوا۔ اس نے پوچھا۔ "کون؟"

اندھیرے میں رُبا کی آواز سنائی دی۔ "میں ہوں تمہاری رُبا۔"

ظلِ سبحانی کا دل دھڑکنے لگا' یہ اس کی وہی رُبا تھی جو شریکِ حیات بھی تھی اور جو شادی سے پہلے اس کی محبوبہ بھی تھی۔ اس کی آواز میں وہی محبوبانہ ترنم تھا۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "رُبا! کیا تم آئی ہو؟"

"ہاں' میں ہی ہوں۔"

"تم گھر سے کیوں چلی گئی تھیں؟"

"یہ دیکھنے کے لئے کہ تم مجھے تلاش کرتے ہو یا نہیں۔ تمہارے دل میں اب بھی میری چاہت ہے یا نہیں؟"

"تم نے کیا دیکھا؟"

"آج گھر سے نکل کر میں نے وہ دیکھا ہے جو اللہ کسی عورت کو نہ دکھائے۔ تم سناؤ وہ رُبا میری سیکرٹری کیسی لگی؟"

ظلِ سبحانی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "وہ تمہاری سیکرٹری بالکل تمہاری طرح لگی ہے' اگر تمہیں اعتراض ہو تو..........."

وہ بات کاٹ کر بولی۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ ہم اس آخری موسم کی بہار دیکھ لیں صرف دیکھنا ہی تو ہے۔"

"پھر تمہیں کس بات کا دکھ ہے؟"

"اس بات کا کہ تم میری تلاش میں نکلے پھر کہیں اور بھٹک گئے۔ آخر میں بھی تو یہی چاہتی ہوں کہ مجھے بھی کوئی چاہتا رہے۔"

"رُبا! تم میری پہلی محبت ہو اور تمہی میری آخری محبت ہو۔ باقی جو کچھ ہے وہ ایک بہلاوا ہے۔ ایک ایسا فریب ہے جو میں خود کو دے رہا ہوں۔"

کمرے کی گہری تاریکی میں رُبا کی ایک سرد آہ سنائی دی۔ ظلِ سبحانی نے کہا۔

"سوئچ آن کرو' میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں ظلّے! صبح سے تم میرے لئے نکلے ہو۔ جانے کیسے کیسے خیالات تمہارے دماغ میں آتے رہے۔ جانے تم نے کیسے کیسے رُوپ میں مجھے دیکھا۔ کیسی کیسی تصویریں بناتے رہے ہو' میں ان تصویروں کو مٹانا نہیں چاہتی' میرا چہرہ میری عمر کے ساتھ اور تمہاری رُبا تمہارے خیال کے ساتھ۔ دونوں میں بہت فرق ہے۔"

ظلِ سبحانی نے آواز کی سمت دیکھا۔ اندھیرے میں رُبا صاف طور پر نظر آرہی تھی۔ وہی اٹھارہ برس کی دوشیزہ' وہی روشن روشن سا چہرہ' وہی کھلے ہوئے گلاب کی طرح تروتازہ صورت' ایسے وقت انسان اپنی عمر کو بھلا دیتا ہے۔ پھر دوسرے کی عمر کو کیسے یاد رکھ سکتا ہے۔ اس نے کہا۔ "سوئچ آن کرو' میں دیکھوں گا۔"

دوسرے ہی لمحے کلک کی آواز کے ساتھ کمرہ روشن ہوگیا۔ جہاں وہ رُبا کو دیکھ رہا تھا وہاں رُبابہ خاتون کھڑی ہوئی تھیں۔ ساٹھ برس کے طویل عرصے میں ایک عمارت پر جو گزرتی ہے وہ رُبابہ خاتون پر گزر چکی تھی۔ وہ اندر سے یقیناً خوبصورت اور مستحکم ہوں گی لیکن باہر سے عمارت کا پلاسٹر جابجا ادھڑا ہوا تھا۔ ظلِ سبحانی نے فوراً ہی آنکھیں بند کرلیں۔ رُبابہ خاتون نے پوچھا۔ "کیا میں چبھ رہی ہوں؟"

"مجھے غلط نہ سمجھو' تاریکی کے بعد اچانک روشنی ہو تو آنکھوں میں چبھنے لگتی ہے۔"

دوسرے ہی لمحے کلک کی آواز سنائی دی اور کمرے میں تاریکی چھاگئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ حیرانی سے سوچنے لگا۔ صبح ربابہ نے گھر سے بھاگ کر کس طرح جوانی کا احساس دلایا تھا۔ خیالات کو بھی جوان کردیا تھا۔ جب بھی میں سوچتا تھا مجھے اٹھارہ برس کی رُبا دکھائی دیتی تھی۔ اب بھی اندھیرے میں وہی محسوس ہوتی ہے۔ تعجب کی بات ہے۔ جسم بوڑھا ہوگیا۔ صورت شکل پہلے جیسی نہ رہی لیکن آواز میں



وہی نسائیت ہے وہی نزاکت۔

رُبابہ خاتون کی آواز سنائی دی۔ "خاموش کیوں ہو آنکھیں کھول کر دیکھو۔ اب میں نظر نہیں آؤں گی۔"

"میں دیکھ رہا ہوں۔ تمہیں سن رہا ہوں۔ تمہاری آواز میں اب بھی وہی کشش ہے۔"

"ہاں' میں کبھی سوچتی ہوں کہ اب یہ آواز ہی رہ گئی ہے۔ جب عمر کا کچھ حصہ اور گزر جائے گا اور بدن میں تھرتھری پیدا ہوگی' اس کے ساتھ آواز بھی تھرتھرانے لگے گی۔"

ظلِ سبحانی نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "ربا! اس عمر میں جو ہونا ہے' وہ ہوگا۔ ہم ہونی کو ٹال نہیں سکتے۔ یہ بتاؤ تم نے گھر سے نکلنے کے بعد اور کیا دیکھا؟"

"بڑے دکھ کی بات ہے۔ میں نے دو بوڑھوں کے ذریعے آج اپنے بیٹوں سے فون پر رابطہ قائم کیا تھا۔ انہوں نے ہمارے بیٹوں اور بہوؤں کو بتایا کہ مجھے اغوا کیا گیا ہے۔ اگر دس ہزار روپے نہ دیئے گئے تو مجھے قتل کردیا جائے گا۔"

"صرف دس ہزار روپے؟"

"ہاں میں دیکھنا چاہتی تھی کہ دس ہزار روپے کی حقیر رقم کے بدلے وہ میری زندگی چاہتے ہیں یا موت؟ جمال سبحانی نے فون پر کہا کہ وہ دس ہزار روپے لے کر آرہا ہے۔ میں خوش ہوگئی۔ جہاں میں چھپی ہوئی تھی وہیں کا پتہ دیا گیا تھا۔ میں ایک کمرے میں تھی' دوسرے کمرے میں وہ بوڑھے تھے' جنہوں نے فون پر گفتگو کی تھی۔ میرے بیٹے نے آکر انہیں دس ہزار روپے دکھاتے ہوئے کہا۔ کیا کہا جانتے ہو؟"

"میں سن رہا ہوں' تم بتاؤ۔"

"ہمارے نالائق بیٹے نے کہا۔ میری امی کو جہاں چھپا کر رکھا ہے وہیں چھپائے رکھو۔ کسی کو خبر نہ ہونے دو۔ میں تمہیں ہر ماہ دس ہزار روپے دیا کروں گا۔ جب ہمارا کام بن جائے گا تو ہم اپنی ماں کو تم سے واپس لے لیں گے۔"

ظلِ سبحانی بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں رُبا کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ہمارے بیٹے چاہتے ہیں کہ تم واپس نہ آؤ؟"

اسے جواب نہیں ملا۔ تاریکی میں ہولے ہولے سسکیاں لینے کی آواز سنائی دے

رہی تھی۔

"رُبا! کیا یہ آخری موسم ہمیں رُلانے کے لئے ہے؟"

"نہیں، ہم نہیں روئیں گے۔ ہمارے پاس جینے کا حوصلہ ہے۔ میں اپنی اولاد سے اب کوئی توقع نہیں رکھوں گی۔ میں انہیں پہلے سے جانتی تھی۔ لاکر میں جو وصیت رکھ ہوئی ہے اس میں، میں نے لکھا ہے۔ اگر راحیل اور بلی نے ایک دوسرے کو جیون ساتھی کی حیثیت سے قبول کیا اور شادی کرلی تو تعلیم مکمل کرنے اور شادی کرنے کے بعد وہ ہماری ٹیکسٹائل ملز کے مالک ہوں گے اور ٹیکسٹائل ملز اسی طرح بورڈ آف ڈائریکٹرز کے تحت جاری رہے گی۔ ہمارے دونوں کام چور بیٹے محنت کریں گے کھائیں گے، اور جو کچھ انہوں نے ہمارے ساتھ کرنا چاہا، انشاء اللہ ایک دن راحیل اور بلی ان کے ساتھ کریں گے۔"

"ربا! میرے پاس آؤ۔ کل صبح میں تمہیں ان نالائقوں کے پاس لے چلوں گا او تمہارے سامنے انہیں دھکے دے کر نکالوں گا۔"

"اب میں واپس نہیں جاؤں گی۔ میں نے یہاں ایک چھوٹا سا کاٹیج بنوایا ہے اب اسی جگہ رہوں گی۔ تم ہسپتال سے وہاں آنا چاہو تو آجانا۔ میں تمہارا انتظار کرو گی۔"

یہ کہہ کر وہ آہستگی سے گھوم گئی۔ دروازے سے باہر گئی پھر ہسپتال کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے باہر پارکنگ لاٹ میں پہنچی۔ وہاں اس کی کار کھڑی ہو تھی۔ اس نے اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ لائٹ آن کی، پھر پارکنگ لاٹ سے نکل کر آہستہ آہستہ ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے کاٹیج کے سامنے پہنچ گئی۔ کا میں اندھیرا تھا۔ باہر ایک بلب روشن تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک وہاں کھڑی اس کاٹیج اپنی آخری پناہ گاہ کو دیکھتی رہی۔ نصف شب کی ہواؤں سے ریشمی لباس پھڑپھڑا رہا آنچل اُڑ رہا تھا۔ وہ اپنے دوپٹے کو سنبھالتی ہوئی برآمدے میں آئی۔ سوئچ آن کر اندر ایک کمرہ روشن ہوگیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کمرے میں پہنچی و سے گزر کر دوسرے کمرے کے دروازے پر آئی۔ سوئچ آن کیا۔ پھر وہ کمرہ بھی رو ہوگیا۔

وہ خواب گاہ تھی۔ بہت پُر تکلف اور قیمتی سامان سے آراستہ کی گئی تھی۔



کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک طرف چپلوں کو اتار کر ملائم قالین پر چلتی ہوئی سنگھار میز کے آئینے کے سامنے آگئی۔ آنکھیں اداس تھیں۔ وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے دراز میں سے کوئی دوا نکالی........... ڈراپر کے ذریعے اسے آنکھوں میں ڈالا۔ پھر اسے رومال سے خشک کیا۔ چہرے کو صاف کیا۔ اپنے بالوں پر برش کرتی رہی۔ ہر زاویے سے خود کو دیکھتی رہی پھر مسکراتی ہوئی اپنے بستر پر آگئی۔

بستر کے دائیں طرف ٹیلیفون رکھا ہوا تھا۔ بائیں طرف ایک خالی گلاس اور ایک پانی سے بھرا ہوا جگ رکھا تھا اس نے آرام سے لیٹنے کے بعد ریسیور اٹھایا۔ پھر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ سارا عالم سو رہا ہوگا ایک وہ جاگ رہی تھی۔ ریسیور کان سے لگائے انتظار کر رہی تھی۔ جسے بھی مخاطب کر رہی تھی وہ یقیناً نیند میں مست ہوگا۔

تھوڑی دیر بعد ایک نیند میں ڈوبی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ کوئی مردانہ آواز تھی۔ "ہیلو؟"

رُبا نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ "ہیلو، میں بول رہی ہوں۔"

دوسری طرف جیسے نیند اُڑ گئی ہو۔ کسی نے چونک کر پوچھا۔ "تم! کیا تم وہی ہو؟ تمہیں میری جان کی قسم! بتادو تم کون ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "تم جاگتے رہو تو میں تمہارے لئے ایک بھٹکی ہوئی آواز ہوں۔ سوتے رہو گے تو آنکھوں کا خواب ہوں۔"

دوسری طرف سے کسی نے تڑپ کر کہا۔ "دیکھو، مجھے پریشان نہ کرو۔ میں دن رات تمہارے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔ تم ایسی ہوگی، تم ویسی ہوگی، تم کیسی ہو؟ کم از کم اپنا پتہ بتادو، یا پھر اپنی تصویر بھیج دو۔ کوئی تو صورت ہو کہ میں اسے اپنی نگاہوں کے سامنے سجا کر رکھ سکوں۔ اسے دیکھتا رہوں، اور فون پر تمہاری آواز سنتا رہوں۔"

وہ بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ "میں ایک موسم ہوں۔ ایسا موسم جو گزر بھی جائے تو تمہارے خیالوں میں پھول کھلاتا رہے گا۔ میں ایک سدا بہار پھول ہوں۔ میرے لئے سوچتے رہو، مجھے ڈھونڈتے رہو۔ میں پھر آؤں گی۔ کل شاید اسی

وقت۔"

یہ کہہ کر اس نے کریڈل پر ہاتھ رکھا۔ رابطہ ختم ہوگیا۔ شاید وہ دوسری طرف اسے پکار رہا ہوگا۔ اس نے پھر دوسرے نمبر ڈائل کئے۔ ریسیور سے کان لگایا اور سننے لگی۔ تھوڑی دیر بعد پھر کسی کی آواز سنائی دی۔ اب وہ بولنے والا کوئی دوسرا تھا اس نے پوچھا۔ "ہیلو' فرمایئے؟"

جواب میں رُبا نے ایک گہری سانس چھوڑ دی' پھر کہا۔ "میں کون ہوں۔ کیا نام بتانے کی ضرورت ہے؟"

دوسری طرف سے جیسے کسی نے چونک کر کہا۔ "ارے تم تو وہی ہو۔ بائی گاڈ عجیب لڑکی ہو۔ اپنا نام بھی نہیں بتاتی ہو۔ آخر تمہیں میرا فون نمبر کیسے معلوم ہوا؟ اور معلوم ہو بھی گیا ہے تو مجھ سے دور کیوں بھاگتی ہو؟ میں یقین سے کہتا ہوں تمہاری آواز اتنی خوبصورت ہے تو تم میرے تصور سے بھی زیادہ حسین ہوگی۔ ایک بار مجھے اپنا پتہ بتادو' نام بتادو' یا اپنا فون نمبر ہی بتادو۔"

وہ اداؤں بھری آواز میں بولی۔ "تمہاری یہی بات اچھی نہیں لگتی۔ ابھی دو دن ہوئے فون سے رابطہ قائم ہوا اور ابھی سے ملنے کی جلدی ہے' پہلے ہمیں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنا چاہئے۔"

دوسری طرف سے کسی نے بے تاب ہو کر کہا۔ "میں نے تمہاری باتوں سے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ بس میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"یہی تو بات ہے کہ تم نے باتوں سے کچھ نہیں سمجھا۔ جب مجھے یقین ہو جائے کہ تم نے مجھے سمجھ لیا ہے تو میں اپنا نام بھی بتاؤں گی اور پتہ بھی۔"

"بھئی کچھ تو اشارے میں سمجھاؤ۔ آخر کون ہو؟ کہاں رہتی ہو؟"

"میں ایک موسم ہوں۔ ایسا موسم جو گزرنے کے بعد بھی تمہارے خیالوں میں پھول کھلاتا رہے گا۔ یہ موسم کبھی نہ گزرنے والا موسم ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے کریڈل پر ہاتھ رکھا اور رابطہ ختم کردیا۔ دوسری طرف اس بے چارے کا کیا حال ہوگا۔ یہ وہی جانتا ہوگا۔ وہ پھر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگی تھوڑی دیر بعد رابطہ قائم ہوا۔ وہ بڑی ہی مترنم آواز میں بولی۔ "ہیلو' میں ہوں۔"

دوسری طرف سے کسی نے بھڑک کر کہا۔ "میں خوب سمجھتا ہوں کہ تم آج ا



ہفتے سے فون کررہی ہو۔ اپنا نام نہیں بتاتی ہو اپنا پتہ بھی نہیں بتاتی ہو۔ میں اب تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔"

وہ ہنسنے لگی۔ پھر ہنستے ہوئے بولی۔ "مجھ سے نفرت ہے تو ثابت کرو ریسیور رکھ دو۔"

دوسری طرف خاموشی چھائی رہی۔ رُبا نے پوچھا۔ "کیا ہوا ریسیور نہیں رکھو گے؟"

ادھر سے شکست خوردہ لہجے میں پوچھا گیا۔ "خدا کے لئے بتاؤ تم کون ہو؟ خدا کی قسم! میں رات کو سونا چاہتا ہوں تو تمہاری آواز کانوں میں رس گھولتی ہے۔ میری نیندیں اُڑا دیتی ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ تمہیں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ ہر سانس میں تمہیں چاہتا رہوں گا۔ اتنا بتادو' تمہارا نام کیا ہے؟ تم کون ہو؟"

"میں ایک موسم ہوں۔ ایسا موسم..........."

وہ بول رہی تھی۔ بولتی جارہی تھی۔ پھر اس نے رابطہ ختم کردیا۔ اس کے بعد اپنے دماغ کی ڈائری سے دوسرے نمبر چنے۔ انہیں ڈائل کیا۔ بات کی۔ نادیدہ ملاقات کی۔ پھر وہ رابطہ بھی ختم کردیا۔

یہ سلسلہ جاری رہا۔ وہ گزرے ہوئے موسموں کی کلیاں چنتی رہی اور اپنے موسم میں پھول کھلاتی رہی۔ حتیٰ کہ کلیاں چنتے چنتے تھک گئی۔ اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا' وہاں سے کروٹ لے کر پلنگ کے بائیں طرف آئی۔ پانی سے بھرے ہوئے جگ کو اٹھایا اور گلاس کو پانی سے بھرلیا۔ پھر اس نے چھوٹی سی دراز کو کھولا ایک شیشی نکالی۔ اس میں خواب آور گولیاں تھیں۔ اس نے دو گولیاں ہتھیلی پر رکھیں شیشی کو واپس اس کی جگہ پر رکھا۔ پھر گلاس اٹھا کر ان گولیوں کو نگل لیا۔ پانی پی لیا۔ گلاس کو ایک طرف رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے ایک سوئچ آف کیا۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ دوسرا سوئچ آن کیا۔ کمرے کی محدود فضا میں خواب آور دھیمی دھیمی سی روشنی پھیل گئی۔ اس نے ایک بٹن کو دبایا۔ کہیں دور سے ہلکی ہلکی موسیقی کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس کی آنکھیں چھت کو تک رہی تھیں۔ ہر طرف سے ایک دھیما دھیما سا شور سنائی دے رہا تھا۔ دل کے دروازے پر چاہنے والوں کی دستک سنائی دے رہی تھی۔ موسیقی بہت ہی مدہم تھی بہت ہی ترنم ریز تھی۔ آنکھیں آہستہ آہستہ

بند ہو رہی تھیں۔

کاٹیج کے باہر بوڑھی رات کا دم نکل رہا تھا۔ صبح ہونے سے پہلے پرانے باسی مرجھائے ہوئے پتے دل کی طرح ٹوٹ رہے تھے۔ رشتوں کی طرح اپنی شاخوں سے چھوٹ رہے تھے اور زمین بوس ہو کر ہوا کے تھپیڑے کھا رہے تھے۔

ابھی وہ ریزہ ریزہ ہونے تک' کائنات میں گم ہونے تک اسی طرح تھپیڑے کھاتے رہیں گے۔

☆======☆======☆

# برائی

برائی کیا ہے؟ ایک برا انسان جب تک اپنے غلط عمل پر پچھتاتا رہے اور اپنی برائیوں سے لڑتا رہے' اس وقت تک اسے برا نہ کہو بلکہ برائی کے خلاف اس کی جدوجہد میں شریک ہو جاؤ۔

سنیتا چلتے چلتے ٹھٹک گئی۔ ایک سفید رنگ کا کاغذ گھاس پر پڑا اس کی طرف منہ اٹھائے تک رہا تھا۔ اس پر کچھ لکھا ہوا تھا اور وہ سنیتا کے تجسس کو دعوت دے رہا تھا کہ آؤ مجھے اٹھا کر پڑھو اور سمجھو کہ میں کیا ہوں؟

اس نے جھک کر اسے گھاس پر سے اٹھالیا۔ شاید وہ کسی فائل سے یا کسی ضخیم مسودے سے بچھڑا ہوا کاغذ تھا۔ وہ اسے پڑھنے لگی' لکھا تھا۔

"جب دن ڈھلتا ہے' درختوں کے سائے پھیلتے اور گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تب میری اداسیوں کی بانہیں پھیل کر مجھے جکڑ لیتی ہیں۔ میں خاموش بیٹھا لوگوں کو اپنے گھروں کی طرف جاتے دیکھتا ہوں۔ سوچتا ہوں' میں کہاں جاؤں؟

میرے کمرے کی ننگی دیواریں میرا منہ چڑاتی ہیں۔ ایک گوشے میں رکھی ہوئی تصویر میرے اندر سسکیوں کو جنم دیتی ہے۔ میں اس کمرے کی وحشت ناک تنہائی میں چیخنا چاہتا ہوں' مگر ان دیکھے ہاتھ میری آواز کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔

رات بہت لمبی اور بھیانک ہوتی ہے ایسی راتیں گزارنے کے لئے نیند کہاں سے لاؤں؟ کئی برس ہوئے نیند تو اس کے ساتھ چلی گئی جس نے یہ رت جگے دیئے ہیں۔

میں نے کئی بار آسمان کی طرف منہ اٹھا کر پکارا ہے' اے میری زندہ ویرانیوں پر سایہ کرنے والے آسمان! مجھے بتا میں کیوں زندہ ہوں؟ مجھے کوئی جواب نہیں ملتا۔ ملتا بھی ہو گا تو وہ گونگا جواب سمجھ میں نہیں آتا۔ تب مجھے ایک ہی جگہ یاد آتی ہے میں اٹھ کر وہاں جاتا ہوں' جہاں شراب ملتی ہے۔ میں اتنی پیتا ہوں کہ مرجاؤں۔ دوسری صبح آنکھ کھلتی ہے تو خود کو زندہ دیکھتا ہوں۔ اس سے میرے جسم میں جان نہیں رہتی۔ تھکن سے بدن چُور چُور ہوتا ہے جیسے کسی سے گھنٹوں لڑتا رہا ہوں۔ تب سوچتا ہوں' لڑتا تو رہا ہوں ایک کالی بھیانک رات سے..........."

یہاں آکر کاغذ خالی ہو گیا تھا' اس لکھنے والے کی زندگی کی طرح خالی۔



"کوئی بہت دکھی ہے بے چارہ!" سنیتا نے ہمدردی سے سوچا۔ پھر چونک کر پلٹ گئی۔ اس کے پیچھے مالتی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ سنیتا نے سامنے ایک درخت کو دیکھا جس کی شاخیں پتوں سے خالی تھیں' ایسا لگ رہا تھا لباس اتار کر ننگا کر دیا گیا ہو۔

مالتی نے سنیتا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہ جانے اس ہرے بھرے پارک میں یہ سوکھا ننگا درخت کیوں رکھ چھوڑا ہے اسے کاٹ کیوں نہیں دیتے؟"

سنیتا نے اپنی لانبی لانبی پلکیں اٹھا کر مالتی کو دیکھا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ "زندگی کا ایک رنگ یہ بھی ہے۔" ایسا کہتے ہوئے وہ کاغذ کو تہہ کر کے اپنے پرس میں رکھنے لگی۔

"ارے یہ کیا کرتی ہو؟" مالتی نے کہا۔ "پھینکو اسے۔"

سنیتا نے مسکراتے ہوئے کاغذ کو پرس میں رکھ لیا۔ "آؤ چلیں۔"

"تم نے کاغذ کو کیوں نہیں پھینکا؟"

"بس پھینکا نہیں گیا۔" وہ دور کہیں دیکھتے ہوئے بولی۔ "کبھی کبھی کوئی چیز دل کو چھو لیتی ہے۔"

مالتی خاموش رہی۔ دونوں دھیرے دھیرے چلتی رہیں وہ مخملی گھاس پر سے گزرتے ہوئے سرخ گلابوں کی کیاریوں کے پاس کچے راستے پر آگئیں۔ پھر سنیتا نے کہا۔ "مالتی! تم میرے پیچھے کھڑی اس کاغذ کی تحریر کو پڑھ رہی تھیں؟"

"ہاں' وہ کوئی دل جلا ہو گا۔"

"میری طرح۔" سنیتا نے سرد آہ بھری۔

مالتی نے کہا۔ "سونی! تمہاری شادی کو پانچ سال ہو گئے تم ابھی تک سمجھوتہ نہیں کر سکیں۔"

"کس سے سمجھوتہ کروں؟"

"اس ماحول سے' جس میں تم گئی ہو۔"

"میں گئی نہیں' پہنچائی گئی ہوں۔"

"ایک ہی بات ہے۔"

"ایک بات نہیں ہے' بہت فرق ہے۔ پہلے میں سمجھتی تھی کہ جسم اور روح میں سمجھوتہ رہتا ہے کیونکہ روح جسم کے اندر ہی رہتی ہے۔ اب پتہ چلا کہ کوئی بات روح

کے مزاج کے خلاف ہو تو وہ جسم میں رہ کر بھی جسم سے الگ رہتی ہے جیسے میں ا۔
ماحول سے الگ الگ سی رہتی ہوں۔"

وہ ہنسنے لگی۔ مالتی نے کہا۔ "یہ کوئی ہنسنے کی بات نہیں ہے۔"

وہ بولی۔ "ایسے حالات بھی ہوتے ہیں کہ رونے کی بات پر ہنسنا آجاتا ہے۔"

"سونی! میری جان! کیا تم بہت دکھی ہو؟"

"بہت دکھی نہیں ہوں۔ بلراج کہتا ہے، تمہیں کیا دکھ ہے میں نے تمہیں دولت
دی، عزت دی، تمہارے پاس اپنی گاڑی ہے۔ ڈھیر سارے ملبوسات اور زیورات
ہیں۔ کتنا ہی خرچ کرو، میں روکتا نہیں کہیں بھی جاؤ، تمہیں ٹوکتا نہیں، پھر تمہیں کیا دُ
ہے؟ لہٰذا تم ہی سوچو مالتی! اتنا سب کچھ ہوتے ہوئے میں بہت دکھی کیسے ہو سک
ہوں؟"

وہ ایک ساعت کے لئے رک کر بولی۔ "جو نظر آتا ہے اور جو نظر نہیں آتا۔ ا
دونوں میں بڑا فرق ہے۔ تم نے کبھی روح کو دیکھا ہے؟"

"بھلا روح کیسے نظر آتی ہے؟"

"بس یہی بات ہے مالتی! جو نظر نہیں آتا۔ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، یہ کو
جان سکتا ہے۔"

دونوں خاموش رہیں۔ جیسے کہنے کے لئے کچھ نہ رہ گیا ہو۔ وہ چلتے چلتے کار
پاس پہنچ گئیں۔ سنیتا نے مقفل دروازے کو کھولا، پھر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر مالتی
لئے دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔ مالتی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری گاڑی بڑ
شاندار ہے۔"

"قیمت بھی بہت دی ہے۔"

"تمہارے بلراج صاحب کہہ رہے تھے کہ ایک لاکھ بیس ہزار میں خرید
ہے۔"

"میں بلراج کی نہیں، اپنی قیمت کی بات کر رہی ہوں۔"

"تمہیں بلراج سے اتنی نفرت کیوں ہے؟"

"کہاں نفرت ہے؟ روز ہی ان کے بیڈ روم میں سوتی ہوں۔ ادائیگی اسے ک
ہیں کہ نفرت بھی ہو تو محبت سے قیمت ادا کی جائے۔ اب بتاؤ کیسی ہے یہ گاڑی؟"



"اوہ سونی پلیز!"

سنیتا نے کار اسٹارٹ کی۔ اسی وقت مالتی نے کہا۔ "سونی! وہ دیکھو بلراج۔"

سنیتا نے ایک طرف دیکھ کر پوچھا۔ "کہاں؟"

"اِدھر نہیں، اُدھر دیکھو۔"

اِدھر اُدھر میں بلراج کی گاڑی گزر گئی۔ سنیتا اسے دیکھ نہیں پائی۔ اس نے گیئر
بدل کر کار کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس کے ساتھ کوئی لڑکی تھی؟"

مالتی نے کہا۔ "ہاں میں نے تو دیکھا ہے مگر تم نے تو دیکھا ہی نہیں تھا۔ یہ کیسے
جان گئیں کہ اس کے ساتھ لڑکی تھی؟"

"بلراج کو تو جانتی ہوں نا۔"

"کیا ہمیشہ ان کے ساتھ کوئی لڑکی ہوتی ہے؟"

"نہیں، وہ ہمیشہ کسی لڑکی کے ساتھ ہوتا ہے۔"

"بات کو پلٹاتی کیوں ہو؟"

"پلٹاتی نہیں، سیدھی طرح بیان کر رہی ہوں۔ محبت تو کسی ایک لڑکی سے ہوتی
ہے نا؟ اور بلراج محبت کا روگ نہیں پالتا۔ وہ تو سیدھا سودا کرتا ہے۔ بھاؤ کیا اور
گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ اس لئے کوئی بلراج کے ساتھ نہیں، بلکہ بلراج کسی نہ کسی
کے ساتھ ہوتا ہے۔"

مالتی نے ناگواری سے پوچھا۔ "یہ لڑکیاں بِکتی کیسے ہیں؟"

"جیسے میں بِک گئی ہوں۔"

"تم نے تو بلراج سے شادی کی ہے۔"

"غلط۔ پھر کہو گی کہ بات پلٹا رہی ہو۔ بلراج نے مجھ سے شادی کی ہے۔"

"بات ایک ہی ہوئی نا؟"

"ایک کہاں ہوئی؟ تم اچھی طرح جانتی ہو، اگر میں شادی کرتی تو میرا پتی بلراج نہ
ہوتا۔"

دونوں خاموش ہو گئیں۔ کار دوڑتی رہی۔ مالتی اپنی سہیلی کے ماضی کے متعلق
سوچتی رہی۔ پھر اس نے پوچھا۔ "سونی! تمہیں پھر کبھی آنند ملا تھا؟"

سنیتا کا ہاتھ اسٹیئرنگ پر ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے ڈگمگاتی ہوئی کار کو جلدی سے

سنبھال لیا' خود کو سنبھال نہ سکی۔ ایک دم سے ماضی میں پہنچ گئی۔ آنند شاید اسے نہیں چاہتا تھا۔ شاید دل کے اندر چاہتا ہو۔ اندر کی بات کون جانتا ہے۔ بظاہر تو اس نے رانی کو پسند کیا تھا۔ رانی کے باپ کے پاس درجنوں کاریں تھیں' اور لاکھوں روپے تھے۔

آنند نے اس سے شادی کرلی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ رانی کی زندگی میں پہلا مرد نہیں ہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ شادی بڑی دھوم دھڑاکے سے ہوئی تھی۔ سیتا سے رہا نہ گیا۔ وہ چھپ کر اسی خوشیاں سمیٹنے والے آنند کو دیکھنے گئی تھی۔ وہ بہت ہی قیمتی کپڑوں میں راجکمار جیسا لگ رہا تھا۔ بڑے لوگوں کی تقریب تھی' شرب کا دور چل رہا تھا۔ رانی نے آنند کو بھی ایک جام پیش کیا۔ پھر اسے وہ جام پیش کرنے کے بعد پاس کھڑے ہوئے ایک نوجوان کی بانہوں میں پہنچ گئی اور اس کے ساتھ ڈانس فلور پر تھرکنے لگی۔

آنند ہاتھ میں جام لئے سوچتا رہا۔ اس کے چہرے سے پتا چل رہا تھا کہ وہ معزز لوگوں کے ماحول میں معزز انداز کی بے حیائی کو برداشت کررہا ہے۔ پھر اس نے جام کو منہ سے لگالیا۔ پہلی بار شراب پی رہا تھا۔ بہت کڑوی لگ رہی تھی۔ شراب ہو یا رانی جیسی عورت' پہلے پہل کڑوی لگتی ہیں۔ پھر آدمی اپنے آپ کو مار مار کر دونوں کو برداشت کرنا سیکھ لیتا ہے۔ اس روز آنند کی شادی تھی اور اس روز آنند کو آنند مار رہا تھا۔

سیتا سوچ رہی تھی۔ اس کی نظریں ونڈ اسکرین کے پار سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ کار مخصوص رفتار سے دوڑ رہی تھی تب ہی مالتی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "کچھ عرصہ پہلے میں نے سنا تھا کہ آنند بہت زیادہ پینے لگا ہے۔ تمہارے بلراج صاحب بھی تو پیتے ہیں۔"

"پیتے نہیں نہاتے ہیں' اور سنو گی تو ہنسو گی میں بھی پیتی ہوں۔"

مالتی حیرانی سے بولی۔ "چل جھوٹی۔ میں نہیں مان سکتی۔"

"ماننا پڑے گا۔ وہ میرا پتی ہے۔"

مالتی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "خوب باتیں بناتی ہو۔ کیا تم نے بلراج کو کبھی ان لڑکیوں کے بارے میں نہیں ٹوکا؟"



"شادی کے ابتدائی دنوں میں ایک بار ٹوکا تھا انہوں نے پوچھا زندہ رہنا چاہتی ہو یا مرنا۔ خاموشی زندگی ہے۔ بولو گی تو............ باقی سمجھ لو۔ اور میں سمجھ گئی۔ اس روز سے کچھ نہیں بولتی۔"

مالتی نے ہمدردی سے پوچھا۔ "تم یہ سب کچھ کیسے برداشت کرلیتی ہو؟"

"ہم انسان ہیں جب مشکل حالت سے گزرتے ہیں تو گزرتے رہنا آجاتا ہے۔ تمہیں اپنا ایک واقعہ سناؤں۔ ایک بار میں' بلراج اور ایک بڑے آفیسر کی بہت ہی خوبصورت بیوی شاپنگ کے لئے گئے۔ کچھ سامان میں نے خریدا' کچھ اس حسینہ نے' میں اس کا نام نہیں لوں گی کیونکہ وہ بہت بڑے آفیسر کی دھرم پتنی ہے۔ ہم کتنی ہی دکانوں سے گزرتے ہوئے ایک جیولر کے ہاں پہنچے۔ وہاں کچھ زیورات خریدتے وقت اس حسینہ کی نظر ایک بہت ہی خوبصورت اور قیمتی ہار پر پڑی۔ اس نے اس ہار کو نکلوایا۔ اسے ہاتھ میں لے کر حیرت سے بولی۔ "ہائے کتنا خوبصورت ہے۔ کتنے پیارے ہیرے ہیں' کتنے کا ہوگا؟"

واقعی وہ بہت خوبصورت تھا۔ دکاندار نے کہا۔ "بہت قیمتی ہے۔"

وہ بہت بڑے آفیسر کی بیوی تھی۔ اکڑ کر بولی۔ "پھر بھی کتنے کا ہے؟"

"صرف ایک لاکھ روپے کا۔"

حسینہ کی انگلیوں سے ہار پھسل کر گر پڑا۔ اسے دیکھ کر یوں لگا جیسے اس کی انگلیوں سے ایک خوبصورت سپنا ٹوٹ گیا ہے۔ تب بلراج نے اس سے کہا۔ "آپ چاہیں تو اسے لے سکتی ہیں۔"

میں نے اور اس حسینہ نے چونک کر بلراج کو دیکھا۔ میں اس لئے چونکی کہ بلراج کسی حسینہ کو اتنی اونچی رشوت نہیں دیتا وہ حسینہ کیوں چونکی' یہ وہی جانے لیکن گھبرائی ہوئی سی بولی۔ "میں' یہ............ یہ لے سکتی ہوں؟"

"جی ہاں' آپ چاہیں تو یہ ہار آج شام تک خرید سکتی ہیں۔"

"وہ کیسے؟" اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"بلراج نے جھک کر آہستگی سے کہا۔ "آپ میری وہ شرط پوری کردیں۔"

اس حسینہ نے ایک دم سے شرماتے اور گھبراتے ہوئے مجھے دیکھا۔ میں جلدی سے انجان بن کر اس ہار کا معائنہ کرنے لگی۔ اسے اطمینان ہوگیا کہ میں ان کی طرف

متوجہ نہیں ہوں۔ وہ آہستگی سے بولی۔ "اپنی بیوی کے سامنے کیسی باتیں کر رہے ہو۔"

"میری بیوی میرے معاملات میں بالکل گونگی بہری ہے۔ اگر آپ جھجک رہی ہیں تو اُدھر چلیں۔"

وہ دونوں مجھ سے دور چلے گئے۔ میں ایک بزنس مین کی بیوی ہوں۔ یہ جانتی ہوں کہ بلراج صرف ہوس کے کاؤنٹر پر مول تول نہیں کرتا۔ اس نے ایک لاکھ روپے کا ہار خرید کر اس حسینہ کو دے دیا۔"

مالتی نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ "تم نے اتنی بڑی بات کیسے برداشت کرلی۔ بلراج صاحب کو چاہئے تھا کہ اتنا قیمتی ہار تمہیں خرید کر دیتے۔ مگر اس عورت کو ہار لے دیا اور یہ تو سراسر گھاٹے کا سودا ہے؟"

"بلراج کے لئے گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔ اس نے وہ قیمتی ہار حسینہ کے شوہر کے سامنے حسینہ کو پیش کیا تھا۔ ایک لاکھ کے ہار کا تحفہ ملا تو اس آفیسر نے بلراج کو پچیس لاکھ روپے کا ٹھیکہ دلا دیا۔"

مالتی نے منہ بنا کر کہا۔ "یہ کیسا گھناؤنا لین دین ہوتا ہے۔"

"مالتی! تم بڑے لوگوں کی بڑی دنیا کو نہیں سمجھ سکتیں۔ تمہارا شوہر ایک کالج کا پروفیسر ہے۔ تمہاری چھوٹی سی دنیا ہے چھوٹی چھوٹی ضروریات ہیں۔ بڑے سے بڑا لالچ نہیں ہے۔ اس لئے تم لوگ ہمارے مقابلہ میں پُرسکون ستھرے ماحول میں زندگی گزارتے ہو۔ مانا کہ میری دولت اور شاندار گاڑی کو دیکھ کر تمہارے اندر بھی کبھی خواہشیں کروٹیں لیتی ہوں گی۔ مگر عورت خواہشات کو کچلنا بھی جانتی ہے۔ ہر عورت بکاؤ مال نہیں ہوتی۔"

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ کار اپنی رفتار سے دوڑتی رہی۔ پھر سنیتا نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "میں جس طبقہ میں جی رہی ہوں' اسے بزنس مین کمیونٹی کہتے ہیں۔ اس کمیونٹی میں کمانا ہی سب کچھ ہے اور کمانے کے لئے خریدا اور بیچا جاتا ہے۔ اب اس آفیسر کی بیوی کی بات لے لو۔ اس کے پتی کے پاس اونچا عہدہ ہے۔ سرکاری گاڑی اور بنگلہ ہے اور اچھی عزت ہے۔ بلراج جیسے دولت منداس کی کرسی کے آگے گھٹنوں کھڑے رہتے ہیں۔ سرکے بنا بات آگے نہیں بڑھاتے۔ اس آفیسر کی گاڑی کا دروازہ ایک شوفر کی طرح کھولتے ہیں۔ اس کے آگے بلراج کچھ نہیں ہے مگر بہت کچھ



ہے۔ کیونکہ بلراج کے پاس خریدنے کی طاقت ہے اور سرکاری ٹھیکوں سے لے کر اس کی بیوی تک کو خرید سکتا ہے۔"

"آج تم بہت بول رہی ہو۔"

"میں چاہتی ہوں کہ تم میرے طبقے کو اچھی طرح سمجھ لو۔"

"سونی! تم میری سہیلی ہو۔ میں تمہیں سمجھتی ہوں' اتنا ہی کافی ہے۔ تمہارے طبقے کو سمجھ کر کیا کروں گی؟"

"تم میرے گھر مہمان بن کر آئی ہو۔ میں نے بلراج سے کہا تھا کہ جب تک مالتی ہمارے ہاں رہے گی' اس وقت تک وہ گھر میں دوستوں کی پارٹی نہیں کرے گا مگر آج وہ بہت ضد کر رہا تھا۔ ایک بہت ہی بدنام اسمگلر ہانگ کانگ سے آیا ہے اور بلراج کل شام اسے اپنے ہاں مدعو کر چکا ہے۔ اس بات پر میری ان سے لڑائی ہو چکی ہے۔"

"تمہیں بلراج سے جھگڑا نہیں کرنا چاہئے۔"

"انہیں بھی میری سہیلی کا مان رکھنا چاہئے۔"

"کیا ہوا؟ میری موجودگی میں پارٹی ہو تو کیا برائی ہے؟"

"مالتی! تم اس ماحول کو نہیں سمجھتی ہو۔"

"واہ اتنی دیر سے سمجھا رہی ہو اور میں سمجھ رہی ہوں۔ پارٹی میں زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ شراب پانی کی طرح بہے گی۔ کچھ ایسی ویسی عورتیں بھی ہوں گی۔ شاید نشہ میں وہ لوگ خلافِ تہذیب گفتگو بھی کریں۔ تمہیں میرے لیے پریشان نہیں ہونا چاہئے اگر وہاں کوئی بات میرے مزاج کے خلاف ہوگی تو میں چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی جاؤں گی۔ پھر تم وہاں موجود ہوگی۔ مجھے کسی سے ڈر نہیں لگے گا۔"

سنیتا اطمینان کا سانس لے کر بولی۔ "تم نے میرے سر سے ایک بڑا بوجھ اتار دیا۔ میں کوشش کروں گی کہ کل کی پارٹی میں کوئی بات تمہارے مزاج کے خلاف نہ ہو' آؤ اب واپس چلیں۔"

یہ کہہ کر اس نے کار روکی' پھر اسے گھر کے راستے پر موڑ لیا۔

☆======☆======☆

شام کے چھ بجے مہمان آنے شروع ہو گئے۔ کوٹھی کے لان میں ایک بہت بڑا غالیچہ بچھا دیا گیا تھا۔ غالیچے کے تین اطراف صوفے تھے۔ چوتھی طرف دو بڑی بڑی

ٹرالیوں میں مختلف شراب کی بوتلیں اور شیشے کے چمکتے ہوئے جام رکھے تھے۔ ان کے پیچھے سفید وردی میں ملبوس بیرے کھڑے تھے۔ باہر ہلکی ہلکی سردی تھی۔ پینے والوں کے لئے موسم بڑا سازگار تھا۔

مالتی نے ریشمی ساری کو بڑی خوبصورتی سے زیب تن کر کے آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ اپنے پتی کی بات یاد آئی۔ وہ کہتا تھا سب ہی عورتوں کو ساری پہننا نہیں آتا۔ تم پہنتی ہو تو ساری تمہارے بدن پر اتراتی ہے۔ بل کھاتی ہے۔ شوخی دکھاتی ہے' خواب جگاتی ہے اور تعبیر چھپاتی ہے۔ یوں نہ پہنا کرو۔ من پاپی ہو جاتا ہے۔"

سیتا کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ کمرے میں داخل ہو کر کہہ رہی تھی۔ "یہ آئینے میں دیکھ کر اپنے آپ مسکرا رہی ہو لگتا ہے پروفیسر جی یاد آ رہے ہیں۔"

مالتی نے آئینے کی طرف سے پلٹ کر سیتا کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ سیتا نے کہا۔ "ایمان دھرم سے بولتی ہوں۔ بڑا غضب ڈھا رہی ہو۔ وہ دھاون تو تمہیں دیکھ کر گھر کا راستہ بھول جائے گا۔"

مالتی نے پوچھا۔ "یہ دھاون کون ہے؟"

"وہی اسمگلر جس کے لئے آج پارٹی کا اہتمام کیا گیا ہے۔ پکا بدمعاش ہے۔ بے دھڑک عورتوں سے دوستی کرنے بیٹھ جاتا ہے۔"

پھر وہ مالتی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی۔ "آؤ جانی محفل میں چلیں۔"

"سونی! مجھے جانی کہہ رہی ہو؟"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "وہ دھاون بات بات پر ہر ایک کو جانی کہتا ہے۔ شاید اپنی ماں کو بھی کہتا ہوگا' چلو۔"

وہ دونوں کوٹھی کے باہر آئیں۔ باہر اندھیرا چھا گیا تھا۔ مگر لان سے احاطہ کے گیٹ تک کتنے ہی بلب روشن تھے۔ بلراج گیٹ کے پاس کھڑا ایک مرد اور ایک عورت کا استقبال کر رہا تھا۔ تبھی ایک لمبی سی کار آ کر رکی۔ اگلا دروازہ کھلا پھر اس دروازے سے ایک قد آور' لحیم شحیم کالا کلوٹا آدمی باہر آیا وہ ایسا تھا کہ بچے اسے اندھیرے میں دیکھ کر ڈر جاتے۔ سیتا نے سرگوشی میں مالتی سے کہا۔ "یہی دھاون ہے۔"

مالتی ناگواری سے اونہہ کہہ کر دوسری دو عورتوں کو دیکھنے لگی جو دھاون کی کار



سے باہر آئی تھیں اور بڑے ناز نخرے سے اپنے لباس کو ذرا اِدھر اُدھر سے درست کر رہی تھیں۔ دھاون نے بلراج سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہیلو جانی! تمہاری پارٹیاں ہانگ کانگ میں بھی یاد آتی رہتی ہیں۔"

ایسا کہتے وقت اس کی نظریں مالتی پر جم گئیں۔ وہ تعریفی انداز میں سیٹی بجا کر بلراج سے بولا۔ "جانی! خوب موتی چن کر لاتے ہو۔"

بلراج نے فوراً ہی دھیرے سے کہا۔ "دھاون! یہ ہماری مہمان ہیں اور ہمارے ماحول سے مختلف ہیں۔ انہیں کچھ کہوگے تو سونی بگڑ جائے گی۔"

دھاون ہنستے ہوئے سیتا کے پاس آیا۔ پھر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "میں اپنی سونی بھابی سے بہت ڈرتا ہوں۔ میری بھابی کی مہمان میری بھی معزز مہمان ہیں' کیوں جانی! میرا مطلب ہے بھابی............"

سیتا نے اپنے کاندھے پر اس کے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارا ہاتھ بہت بھاری ہے۔"

وہ ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولا۔ "میں نے تو سنا تھا' پاؤں بھاری ہوتے ہیں۔"

سیتا بولی۔ "ہاں کسی کے بھاری ہوئے تھے' پھر تم پیدا ہو گئے۔"

وہ ایک دم سے جھینپ کر ہنستے ہوئے بولا۔ "بلراج جانی! بھابی سے تو کچھ بولتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے آس پاس کھڑی ہوئی عورتوں کی کمر میں ہاتھ ڈالا۔ پھر اپنی کمر کو ٹھمکے دیتا ہوا کبھی اِدھر والی سے اور کبھی اُدھر والی سے ٹکراتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ بلراج نے اس کی رہنمائی کی۔ دوسرے مہمانوں سے اس کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد اونچی آواز میں بولا۔ "لیڈیز اینڈ جنٹل مین! ہمارے درمیان صرف ایک مہمان ایسی ہیں' جو شراب کو زہر اور مرد عورت کی بے تکلفی کو پاپ سمجھتی ہیں۔ یہ شریمتی مالتی دیوی ہیں۔ میری بیوی کی کالج فرینڈ۔ یہ کئی سال بعد ہم سے ملنے آئی ہیں۔ افسوس کہ یہ ڈرنک نہیں کرتیں۔"

تمام نظریں مالتی پر جم گئیں۔ بلراج نے کہا۔ "ہمارے گلاسوں میں صرف ایک گلاس کا رنگ جدا ہوگا۔"

دھاون نے زیر لب کہا۔ "بالکل جدا ہے۔ جواب نہیں ہے میں سوالی بن گیا۔"

باوردی بیرے شراب سے بھرے ہوئے گلاس کی ٹرے اٹھائے ہر ایک کے پاس

پہنچ رہے تھے۔ ٹرے پر سے گلاس کم ہوتے جا رہے تھے۔ مالتی نے کانپتے ہوئے ہاتھ
سے جوس کا گلاس اٹھایا۔ اس بات پر سب ہی قہقہے لگانے لگے۔ مالتی کو کسی کی پروا
نہیں تھی۔ وہ صرف یہ دیکھ کر افسوس کر رہی تھی کہ سنیتا بھی اس ماحول کے رنگ میں
خود کو رنگنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بھی شراب کا ایک گلاس تھا۔ وہ مالتی
سے منہ چھپانے کے لئے اپنے پتی کے روبرو کھڑی ہو گئی تھی۔

ذرا سی دیر میں محفل کا رنگ بدلنے لگا۔ جام خالی ہونے لگے چہروں پر خمار جھلکنے
لگا۔ ساریوں کے آنچل ڈھلکنے لگے۔ نگاہوں کو گستاخی آگئی۔ آوازیں دبی دبی تھیں
ہنسی کبھی کبھی تھی۔ شرابی شرابی ہاتھوں میں پیمانوں کے بدن کانپ کانپ جاتے تھے
پھر ریکارڈ پلیئر سے مستی بھری موسیقی ابھرنے لگی۔ دھاون نے کہا۔ "جانی! رقص کے
بغیر موسیقی کا مزہ نہیں آتا۔ آؤ اندر چلیں۔ وہاں خوب ناچیں گے۔"

اس کی فرمائش پر پینے اور ناچنے گانے کا سامان اندر پہنچایا گیا۔ ایک بار پھر نئے
سرے سے محفل کا آغاز ہوا۔ اس بار خالی شراب نہیں تھی۔ رقص کرتے ہوئے جسم
بھی تھے۔ دھاون مستی میں آگیا تھا۔ وہ شراب سے بھرا ہوا جام لے کر مالتی کے پاس
آیا۔ پھر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "تھوڑی سی پی لو۔"

اتنے میں سنیتا نے آکر اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا' پھر کہا۔ "دھاون جی! جو
پیتے ہیں انہیں پلائیے۔ طوفان میں تناور درخت کو گرا دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا
لیکن پُرسکون پانی میں پتھر پھینکنا گناہ ہے۔"

دھاون نے اس کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ "اوہ بھابی! تم
تو ٹھیک وقت پر سماج کی طرح سامنے آجاتی ہو۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ایک عورت کی طرف بڑھ گیا۔ پھر اس کے ساتھ ناچنے لگا۔ سنیتا
نے مالتی کا ہاتھ پکڑ کر رسوئی گھر کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ "تم اکیلی بیٹھ کر کچھ
کھالو۔ پھر سونے چلی جانا۔ ابھی تو یہ لوگ کھانے کے بعد بھی پئیں گے۔ صبح تک تاش
کی بازی جمی رہے گی۔"

مالتی نے کہا۔ "ایسے ماحول میں دم گھٹنے لگتا ہے۔ زندگی میں پہلی بار ایسی بیہودہ
پارٹی دیکھی ہے۔ مگر مجھے اکیلے نیند نہیں آئے گی۔"

سنیتا نے کہا۔ "تم دروازے کو اندر سے بند نہ کرنا۔ میں کسی وقت بھی تمہارے



پاس سونے کے لئے آجاؤں گی۔"

رسوئی گھر میں پہنچ کر اس نے خود مالتی کے لئے ہانڈیوں سے کھانا نکالا۔ پھر اس
کے سامنے چھوٹی سی میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ "تم کھاؤ' میرا پارٹی میں رہنا ضروری
ہے۔ میں وہاں نہیں رہوں گی تو وہ تمام دولت مند بدمعاش بلراج کو طعنے دیں گے کہ
اس کی دھرم پتنی بیک ورڈ ہے۔ ایٹی کیٹ نہیں جانتی ہے۔"

مالتی نے کھانا شروع کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری مجبوریاں سمجھتی ہوں۔" پھر
ہنستے ہوئے بولی۔ "جانی! تم جاؤ۔"

سنیتا نے اس کے گال پر ہلکی سی چپت مار کر کہا۔ "تمہارے منہ سے جانی کا لفظ کتنا
پیارا لگتا ہے۔ ابھی پروفیسر صاحب سن لیتے تو بے اختیار تمہیں کھانے پر سے اٹھا کر لے
جاتے۔ اصلی بات یہ ہے مالتی کہ لفظ برے نہیں ہوتے' ان کی ادائیگی اچھی بری ہوتی
ہے۔ یہی جانی کا لفظ دھاون کے منہ سے گالی لگتا ہے اور تمہاری زبان پر آکر پیار کا
سندیس بن جاتا ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے چلی گئی۔ مالتی نے دل میں کہا۔ "لوگ تو لفظوں کی طرح
عورتوں کو بھی کبھی پیار اور کبھی گالی بنا دیتے ہیں۔ سونی! جب تمہیں آنند کا پیار ملا تھا'
تب تم کتنی معصوم کتنی شرمیلی تھیں۔ کسی بھی محفل کی جان تھیں۔ بلراج نے اپنی
محفل کی جانی بنا دیا ہے۔"

وہ کھانے کے بعد اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ کوٹھی کے بڑے ہال سے موسیقی کی
تیز دھن سنائی دے رہی تھی۔ قہقہوں کی آوازیں بھی ابھرتی تھیں جن میں دھاون کا
قہقہہ زوردار ہوتا تھا۔ مالتی نے زیرو پاور کا بلب آن کر کے بتی بجھا دی۔ ساری کو اتار
کر نائٹ گاؤن پہنا۔ پھر دروازے کی چٹخنی کو نیچے گرا دیا کیونکہ سنیتا نے آنے کے لئے
کہا تھا۔

بستر پر لیٹ کر اس نے سوچا۔ "سونی کے پاس وہ سب کچھ ہے جس کے میں
خواب دیکھا کرتی تھی۔ کار' کوٹھی' بنک بیلنس' گھر میں بھی نوٹوں کی گڈیاں نظر آتی
رہتی ہیں۔ ساریاں کتنی ہی قیمتی ہوں' ایک بار سے زیادہ نہیں پہنتی کتنے ہی لوگ اس
کے آگے ہاتھ جوڑ کر نمستے کہتے ہیں۔ سوسائٹی میں اس کی بڑی عزت ہے۔ اندر سے
دکھی ہے تو کیا ہوا۔ اندر سے کتنے ہی لوگ مرتے ہیں۔ اوپر سے خوشحال زندگی کا بھرم

رکھا جاتا ہے۔"

وہ سوچتی رہی، کروٹیں بدلتی رہی۔ پھر جانے کب آنکھ لگ گئی۔ سپنے میں اس نے خود کو قیمتی لباس میں دیکھا۔ وہ ایک قیمتی کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ اس کی شاندار کوٹھی کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا اور اس کے سر پر نوٹوں کی بارش ہو رہی تھی۔ کوئی اسے سمجھا رہا تھا کہ اپنی قیمت لگائے بغیر یہ قیمتی دنیا حاصل نہیں ہوتی۔ تمہارا وہ پروفیسر پتی تمہیں کچھ نہیں دے سکے گا۔ دنیا کو ٹھوکروں میں اڑانا چاہتی ہو تو میرے پاس چلی آؤ جانی!

اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ مارے دہشت کے چیخنا چاہتی تھی۔ مگر ایک سیاہ پتھر جیسا کھردرا ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا۔ کمرے کی نیم تاریکی میں دھاون کے سیاہ چہرے سے سفید دیدے جھانک رہے تھے۔ ہوس پکار رہی تھی وہ تلملانے لگی۔ تب دھاون کا دوسرا ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے آیا۔ سو سو کے نوٹوں کی چند موٹی گڈیاں نظر آئیں۔ اس نے دھیرے سے خوشامد کی۔ "جانی! مان جاؤ، یہ میرے لے پچیس پیسے ہیں تمہارے لئے پچیس ہزار ہیں۔ کہو تو پچیس پیسے اور بڑھا دوں۔"

مالتی اپنے دونوں ہاتھوں کو زور لگا کر اس کے ہاتھ کو منہ سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ بولا۔ "ہاتھ ہٹاؤں گا تو شور مچاؤ گی۔ میں کسی کی پروا نہیں کرتا مگر بلراج کی خاطر بھابی کا لحاظ کرتا ہوں۔ اگر وہ آجائیں گی تو.........."

"میں آگئی ہوں۔" سیتا کی کڑکتی ہوئی آواز سنتے ہی وہ اچھل کر سیدھا ہوا اور دروازے کی طرف پلٹ گیا۔ سیتا نے ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیتے ہوئے کہا۔ "یہ پروفیسر کی بیوی ہے، جو تعلیم کی روشنی میں نئی نسل کو انسان بناتا ہے۔ تم ساری زندگی دولت کماتے رہو، تب بھی اس عورت کو نہیں خرید سکو گے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس دوران مالتی بستر پر بیٹھ گئی تھی اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رو رہی تھی۔ سیتا نے منہ پھیر کر دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "میں شرمندہ ہوں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اور تمہارا سامنا کر سکوں۔ میں جا رہی ہوں۔ دروازہ اندر سے بند کر لو۔ صبح سے پہلے کوئی بھی پکارے تو دروازہ نہ کھولنا۔"



یہ کہتے ہی وہ چلی گئی۔ مالتی اس کی ندامت کو سمجھتی تھی اس لئے اس نے اسے نہیں روکا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کو بند کیا۔ پھر بستر پر آکر لیٹ گئی۔ تب اسے یاد آیا کہ وہ نیند میں کیسے للچانے والے سپنے دیکھ رہی تھی۔ اپنے پتی کے بستر پر سوتے وقت وہ کبھی ایسے خواب نہیں دیکھتی تھی۔ تب اس نے سوچا کہ عورت کو اپنی حیثیت سے اونچے مقام پر مہمان بن کر بھی نہیں جانا چاہئے۔ اپنے اندر دولت مند بننے کی سوئی ہوئی خواہشات جاگ جاتی ہیں۔ جو بھٹکنا نہیں جانتی، اسے بھی بھٹکنا آجاتا ہے۔ ہے بھگوان! میں تو صبح ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

صبح اس نے سامان باندھ لیا۔ ملازم سے کہا کہ سیتا کو اس کے جانے کی اطلاع دے دے۔ واپسی پر ملازم ناشتہ کی ٹرے لے کر آیا، پھر بولا۔ "آپ ناشتہ کریں، مالکن ابھی آتی ہیں۔"

اس نے ناشتہ کرنے کے بعد چائے پی مگر سیتا نہیں آئی۔ اس نے پھر ملازم سے کہا۔ "مدن! اپنی مالکن سے کہو گاڑی کا وقت ہو رہا ہے۔ جلدی آئیں۔"

مدن گیا۔ واپسی پر ایک رقعہ لے کر آیا۔ مالتی نے کھول کر پڑھا۔ لکھا تھا۔

"پیاری بہنا!

کل جو کچھ ہوا، میں اس پر اتنی شرمندہ ہوں کہ تمہیں منہ نہیں دکھا سکتی۔ میرا ضمیر کہتا ہے کہ تم آنکھ اٹھا کر دیکھو گی تو میں مرجاؤں گی۔ مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارے سامنے نہیں آسکتی۔ مدن تمہیں اسٹیشن چھوڑ آئے گا۔

تمہاری سونی!"

مالتی نے اس رقعہ کو پڑھنے کے بعد افسوس کرنے کے انداز میں ایک گہری سانس لی۔ پھر مدن سے سامان اٹھانے کے لئے کہتے ہوئے کوٹھی کے باہر جانے لگی۔

☆======☆======☆

بلراج رات بھر جاگتے رہنے اور پیتے رہنے کے بعد تمام دن بے سدھ ہو کر سوتا رہا اور سیتا کمرے میں آتے جاتے اسے دیکھ کر کڑھتی رہی۔ وہ سہ پہر ساڑھے تین بجے بیدار ہوا۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر کھانے کے لئے بیٹھا تو سیتا نے کہا۔ "آدمی کو اتنا ہی پینا چاہئے جتنا کہ وہ آدمی رہ سکے۔"

وہ لقمہ چباتے ہوئے بولا۔ "اوہ۔ اچھا تم دھاون کی بات کر رہی ہو۔ وہ تھوڑا بہک گیا تھا۔"

وہ غصے سے بولی۔ "ایسے میں مالتی کا پتی موجود ہوتا تو؟"

"تو کچھ نہ ہوتا۔ شریف لوگوں کو تم نے کبھی یہ واویلا کرتے نہیں دیکھا ہوگا کہ کسی بدمعاش نے ان کی بیوی بہن یا بیٹی پر ہاتھ ڈالا ہے۔ عزت محفوظ رہ جائے تو بات کو چار دیواری سے باہر جانے نہیں دیتے۔ مالتی کا پتی بھی یہی کرتا چپ چاپ بیوی کو لے کر یہاں سے چلا جاتا۔ کوئی بات نہیں میں ابھی مالتی کے پاس جاکر معافی مانگ لوں گا۔"

"ابھی آپ نے کہا نا کہ شریف لوگ چپ چاپ اپنی جگہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔"

"اوہ' تو وہ چلی گئی ہے۔" وہ کھانے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے افسوس ہے۔"

"کیا افسوس کرنے سے بات ختم ہوجاتی ہے؟ کیا وہ پارٹی دو چار روز کے بعد نہیں ہوسکتی تھی؟"

"نہیں' ایک دن کی بھی دیر ہوجاتی تو ہانگ کانگ سے اسمگل کیا ہوا تمام مال سیٹھ دھرم داس خرید لیتا یا پھر پولیس والے چھاپہ مارتے۔ دونوں صورتوں میں میرا نقصان ہوتا۔"

سیتا اٹھ کر جانے لگی' وہ بولا۔ "سنو' ایک بات پوچھتا ہوں۔ برا مت ماننا۔ کیا مالتی خریدی نہیں جاسکتی؟"

وہ بھڑک کر بولی۔ "آپ کیا بکواس کر رہے ہیں؟"

"ذرا شانت ہو کر سنو۔ دھاون کے مال کا دوسرا کھیپ آنے والا ہے۔ ادھر دھاون کے دماغ میں مالتی کے لئے ضد بڑھ گئی ہے۔ اسے پانے کے لئے وہ بہت آگے بڑھ سکتا تھا اپنے آدمیوں سے مالتی کو اسمگل کرسکتا تھا مگر دو باتوں نے اسے روکا ایک یہ کہ وہ تمہیں بہت مانتا ہے' تمہیں ناراض کیے بنا مالتی کو پانا چاہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ پولیس والے اسے گرفتار کرنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ وہ مالتی کو پار کرکے ایسی کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتا۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم مالتی کو رشوت کے طور پر پیش



کر کے مال کا دوسرا کھیپ.........."

وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔ "بس آگے کچھ نہ کہنا۔ اگر مالتی آگے جاسکتی تو پیچھے نہ جاتی۔ میں اس کے آگے شرمندہ ہوں اور مجھے خوشی بھی ہے کہ اسے کوئی خرید نہیں سکتا۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ غصہ سے اس کا دماغ گرم ہو رہا تھا۔ وہ چار دیواری میں گھٹن محسوس کر رہی تھی۔ باہر جانے ہی سے سکون مل سکتا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کنگھی چوٹی کی' لباس تبدیل کیا' پرس میں سو سو کے کچھ نوٹ رکھے۔ پھر تیزی سے چلتے ہوئے کوٹھی کے باہر جانے لگی۔ پورچ میں کار کھڑی ہوئی تھی۔ لان میں بلراج بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے سیتا کو دیکھا تاکہ وہ کچھ بولے' بتائے کہ کہاں جارہی ہے؟ مگر اس نے خاموشی سے کار اسٹارٹ کی۔ بلراج کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ کار ڈرائیو کرتے ہوئے کوٹھی کے احاطے سے نکل کر اس سے دور چلی آئی۔

اس نے یہ نہیں سوچا کہ کہاں جانا ہے۔ یونہی کار ڈرائیو کرتی ہوئی اسی پارک میں پہنچ گئی جہاں اسے وہ سفید کاغذ ملا تھا۔ وہ جگہ اسے پسند تھی۔ وہاں بھیڑ اور ہنگامہ کم اور سکون زیادہ تھا۔ اس نے کار ایک طرف پارک کی۔ اسے لاک کیا' پھر سبز ملائم گھاس پر آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

جس درخت کے پاس اسے کاغذ ملا تھا' وہاں نظر پڑتے ہی وہ رک گئی۔ درخت کے پاس کچھ لوگوں کی بھیڑ تھی۔ وہ ایک دوسرے سے دبی آواز میں کچھ بول رہے تھے اور اس شخص کو دیکھ رہے تھے جو میلے کپڑے میں ملبوس اور اوندھے منہ درخت کے پاس پڑا تھا۔ ایک آدمی وہاں سے پلٹ کر آرہا تھا۔ سیتا نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

وہ ناگواری سے بولا۔ "سالے اتنی شراب پی لیتے ہیں کہ ہوش نہیں رہتا۔ اب پولیس والے اسے گھسیٹ کر حوالات میں پہنچادیں گے۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ سیتا بھی پلٹ کر جانا چاہتی تھی۔ پھر ایک دم سے ٹھٹک گئی۔ اس کی نظر اس شرابی کے سرہانے گئی تھی۔ اس کے سر کے نیچے ویسے ہی سفید کاغذات دبے ہوئے تھے۔ سیتا نے جتنا پڑھا تھا شاید اس کے آگے ان کاغذات میں لکھا ہوگا۔ وہ بے اختیار اُدھر جانے لگی۔

وہ اُدھر آئی' جدھر شرابی کا چہرہ تھا۔ دو آدمیوں نے دو طرف ہٹ کر اسے

راستہ دیا۔ ایک نے کہا۔ "شراب پی رکھی ہے۔ پولیس کو بلایا ہے۔"

وہ جیسے کچھ نہیں سن رہی تھی۔ اس کی نظریں شرابی کے چہرے پر جم گئی تھیں۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے اور دل سینے کی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر کہہ رہا تھا۔ "آنند........."

کسی نے پوچھا۔ "کیا آپ اسے جانتی ہیں؟"

"آں؟" وہ چونک کر بولی۔ "ہاں جانتی ہوں۔"

"یہ آپ کے کون ہیں؟"

دل نے کہا۔ "یہ میرا سنسار تھا۔ اب یہ میرا کیا ہے؟ میں کیا بتاؤں؟"

پھر وہ سنبھل کر بولی۔ "کسی سے کوئی ناتہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ بس میں جانے کی حد تک انہیں جانتی ہوں۔ وہ قریب ہی میری گاڑی کھڑی ہے۔ آپ لوگوں کی مہربانی ہوگی اگر انہیں اٹھا کر وہاں پہنچا دیں۔"

سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک نے کہا۔ "چلو بھئی کہتی ہے تو پہنچا دیتے ہیں۔"

اتنے میں کسی نے چیخ کر کہا۔ "پولیس۔" پولیس کا نام سنتے ہی بھیڑ چھٹنے لگی۔ لوگ ذرا دور کھڑے ہوگئے۔ دو کانسٹیبل کے ساتھ ایک لمبا تڑنگا سرخ و سفید آدمی کرتہ پاجامہ میں ملبوس آ رہا تھا۔ اس کی صحت قابل رشک تھی۔ کرتے کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ بازوؤں کی مچھلیاں بتا رہی تھیں کہ اگر وہ کسی کی گردن بازو میں دبوچ لے تو گردن رہ جائے گی، دم نکل جائے گا۔

کسی نے کہا۔ "میٹھی دادا آ رہا ہے۔"

کسی اور نے دبی آواز میں کہا۔ "خونی درندہ ہے۔ پولیس والے بھی اس سے ڈرتے ہیں۔"

میٹھی دادا نے قریب آ کر آنند کو دیکھا۔ پھر سر ہلا کر کہا۔ "ہاں، یہ ہمارے آنند بابو ہیں۔ حوالدار جی تم نے اچھا کیا جو مجھے یہاں لے آئے۔" پھر اس نے بھیڑ کو دیکھتے ہوئے گرج کر کہا۔ "تماشہ کیا دیکھ رہے ہو۔ چلو بھاگو یہاں سے۔ اے تم جا کر آنند بابو کے لئے ایک ٹیکسی لے آؤ۔"

"میرے پاس گاڑی ہے۔"



سیتا کی آواز پر میٹھی دادا نے اسے دیکھا۔ پھر چونک کر کہا۔ "آپ؟"

میٹھی دادا کا انداز ایسا تھا جیسے وہ سیتا کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ بولی۔ "جی ہاں، میں انہیں گھر تک چھوڑ آؤں گی۔"

دادا نے جھک کر آنند کو دونوں بازوؤں میں اٹھایا۔ وہ جانا چاہتا تھا۔ پھر رک گیا۔ اس کی نظریں بکھرے ہوئے کاغذات پر تھیں۔ سیتا نے کہا۔ "میں اٹھا لیتی ہوں۔"

اس نے تمام کاغذات سمیٹ لئے۔ پاس ہی پڑی ہوئی نیلی فائل میں انہیں رکھا۔ پھر فائل لے کر تیزی سے چلتے ہوئے کار کے پاس آ کر پچھلا دروازہ کھولا۔ میٹھی دادا نے آنند کو پچھلی سیٹ پر لٹا دیا خود سمٹ کر بیٹھتے ہوئے دروازے کو بند کیا۔ سیتا نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "راستہ بتاتے رہیں۔"

"ملکہ گنج کے چوراہے تک چلئے۔"

گاڑی آگے بڑھ گئی۔ وہ ڈرائیو کر رہی تھی۔ اس کے دل میں درد ہو رہا تھا۔ نگاہوں کے سامنے ونڈ اسکرین کے پار سڑک تو نظر آ رہی تھی مگر سڑک سے زیادہ آنند کی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بڑے کرب سے سوچ رہی تھی۔ "یہ آنند کے ساتھ کیا ہوگیا ہے؟ جب اسے آخری بار دیکھا تھا تو رانی کا دولہا بنا ہوا تھا۔ قیمتی کپڑوں میں شہزادہ لگ رہا تھا۔ آج وہی شہزادہ میلے کچیلے کپڑے پہنے شراب کے نشہ میں ایک لاوارث کی طرح وہاں زمین پر پڑا تھا۔ کیا ہوگیا ہے اسے؟ کتنا کمزور ہوگیا ہے؟ آہ! تقدیر بدلتی ہے تو آدمی کا حلیہ بھی بدل کر رکھ دیتی ہے۔"

ملکہ گنج پہنچ کر میٹھی دادا آگے رہنمائی کرنے لگا۔ آگے راستہ کچا اور ناہموار تھا۔ آس پاس کچے مکانات کا سلسلہ تھا۔ اندھیرے اور اوس کی دھند میں وہ علاقہ پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ننگ دھڑنگ بچے کھیلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ غریب عورتیں پھٹے پرانے کپڑے پہنے اس قیمتی کار کو یوں دیکھ رہی تھیں جیسے پہلی بار اس علاقہ سے کوئی گاڑی گزر رہی ہو۔ میٹھی دادا نے کہا۔ "آگے دائیں طرف دیوار پر گھوڑا چھاپ بیڑی کا بورڈ لگا ہے ہوا ہے وہیں آنند بابو رہتے ہیں۔"

سیتا نے اسی جگہ گاڑی روک دی۔ گاڑی کے آس پاس مردوں عورتوں اور بچوں کی بھیڑ لگنے لگی۔ میٹھی دادا نے آنند کی جیب ٹٹول کر چابی نکالی۔ پھر ایک عورت کو بلا

کر کہا۔ "پھول وتی! یہ چابی لے اور دروازہ کھول دے۔"

پھول وتی نے دروازہ کھولا۔ کمرے کی بتی جلائی۔ ایک طرف چارپائی پڑی تھی اس کا بستر درست کیا۔ اتنے میں میٹھی دادا نے آنند کو بازوؤں میں لا کر وہاں لٹا دیا۔ اس کے پیچھے سنیتا کمرے میں آئی۔ چھوٹے سے کمرے میں عجیب گیلی گیلی سی مہک تھی فرش کچا اور دیواروں کا پلاسترا دھڑا ہوا تھا۔ کمرے کا جائزہ لینے کے دوران وہ چونک گئی۔ دل پھر تیزی سے دھڑکنے لگا۔ آنند کے سرہانے ایک پرانی شکستہ میز پر اس کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ تصویر میں وہ مسکرا رہی تھی۔

اپنی تصویر وہاں دیکھ کر سنیتا کے من میں خوشی لہرائی۔ وہاں آنند کی بیوی رانی کی تصویر ہونی چاہئے تھی، لیکن نہیں تھی۔ یہ ثبوت تھا کہ اس نے رانی سے شادی کی محبت نہیں کی۔ سنیتا سے محبت کی، شادی نہ کر سکا۔ محبوبہ بیوی نہ بن سکے تو حسرت بن جاتی ہے، جسے مرد تاحیات دل کے فریم میں سجا کر رکھتا ہے۔

میٹھی دادا نے کہا۔ "میں پارک میں آپ کو دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ آپ یہی تصویر والی ہیں۔ آپ سنیتا دیوی ہیں نا؟"

"جی ہاں۔" وہ آنند کے پاس چارپائی کے سرے پر بیٹھ گئی۔ پھر اس کے ہاتھ تھام کر بولی۔ "آپ آنند کو کب سے جانتے ہیں؟"

"یہی کوئی سال بھر سے۔ ایک بار آنند بابو نے میری جان بچائی تھی۔"

سنیتا نے حیرانی سے دیکھا۔ وہ بولا۔ "یہ سچ ہے۔ قصہ یوں ہے کہ میں ایک اندھیری رات میں اپنے اڈے سے اٹھ کر آ رہا تھا۔ ہم جیسوں کو روز خطروں سے کھیلنا پڑتا ہے۔ اگرچہ لوگ ہمارا نام عزت سے لیتے ہیں مگر ہم جانتے ہیں کہ وہ ڈر سے ہماری عزت کرتے ہیں۔ اندر ہی اندر ہم سے جلتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ کسی طرح ہمیں خاک میں ملا دیں۔ ایسا ہی ایک شخص ہاتھ میں چاقو لئے اندھیرے میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں اس سے بے خبر تھا۔ اچانک ہی آنند بابو، ادھر آ نکلے۔ اس وقت میں انہیں نہیں جانتا تھا۔ اس وقت ان کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ جب انہوں نے کسی کو چاقو اٹھائے میری پیٹھ کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تو چونکے۔ پھر دوسرے ہی لمحے انہوں نے وہ بوتل اس کے سر پر توڑ دی۔ میں چونک کر پلٹا۔ وہ آدمی کراہ رہا تھا۔ اس کا چاقو دور جا گرا تھا، اور آنند بابو حیران سے کھڑے تھے۔"



میٹھی دادا نے ایک ذرا توقف کے بعد کہا۔ "میں نے اس آدمی کے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کا چہرا اٹھاتے ہوئے دیکھا۔ وہ وہی تھا جس سے صبح میرا جھگڑا ہوا تھا۔ میں نے دور پڑے ہوئے چاقو کو اٹھا کر اس کا قصہ تمام کرنا چاہا مگر آنند بابو بیچ میں آ گئے۔ چیخ کر بولے۔ "نہیں، میں نے آپ کو مرنے نہیں دیا، اسے بھی مرنے نہیں دوں گا۔ ہم کون ہوتے ہیں کسی کی زندگی سے کھیلنے والے؟"

آنند بابو کی یہ بات میرے دل میں اتر گئی۔ میں نے دشمن کو چھوڑ دیا اور انہیں دوست بنا لیا۔"

سنیتا نے پوچھا۔ "انہوں نے اپنی یہ حالت کیوں بنالی ہے؟"

"میں نے زیادہ پینے سے بار بار منع کیا مگر یہ نہیں مانتے۔ پیتے چلے جاتے ہیں۔ اتنا سمجھ گیا ہوں کہ زندگی میں جو حادثے گزرے ہیں، انہیں بھلانے کے لئے پیتے ہیں؟"

"آپ نے کبھی پوچھا کہ یہ دکھی کیوں ہیں؟"

"سنیتا جی! آنند بابو ان لوگوں میں سے ہیں، جو اپنا سکھ بانٹتے ہیں اور دکھ چھپا لیتے ہیں۔ ایک بات پوچھوں؟ ان سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟"

وہ پہلے ہچکچائی، پھر سر جھکا کر بولی۔ "آپ نے یہ سوال کبھی ان سے کیا؟"

"کیا تھا، کئی بار جواب دینے سے کترا گئے۔ ایک بار پینے کے دوران کہنے لگے کچھ رشتے اوپر سے کچھ نہیں ہوتے، اندر سے بہت گہرے ہوتے ہیں۔ دل میں پھانس کی طرح کھٹکتے رہتے ہیں۔ نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے ہونے کا احساس قائم رہتا ہے۔"

اتنے میں کسی نے دروازے پر آ کر کہا۔ "دادا! راؤ صاحب آئے ہیں تمہیں پوچھ رہے ہیں۔"

"اچھا آتا ہوں، تم چلو۔" یہ کہہ کر دادا نے سنیتا سے کہا۔ "تھانیدار اپنا بھتہ لینے آیا ہے۔ میں اس سے نمٹ کر ابھی آتا ہوں۔"

وہ تیز قدم بڑھاتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی سنیتا کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ آنسو بھری آنکھوں سے آنند کو دیکھتے ہوئے کبھی اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی، کبھی اس کے چہرے کو سہلانے لگی۔ جی میں آ رہا تھا کہ اس سے لپٹ کر زور زور سے رونا شروع کر دے مگر وہ ضبط کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد آنند کراہنے لگا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کیونکہ وہ آنکھیں بند

کیے کروٹ بدل رہا تھا۔ پھر کروٹ بدلتے ہی اس کی ایک ٹانگ چارپائی کی پٹی سے باہر لٹک گئی سیتا نے آگے بڑھ کر اس کی ٹانگ کو بستر پر سیدھا کیا۔ اتنے میں اس کا ایک ہاتھ چارپائی سے نیچے جھولنے لگا۔ اب اس کی آنکھیں ذرا سی کھلی تھیں اور وہ نیچے رکھے ہوئے پانی کے جگ کو پکڑ رہا تھا۔

سیتا ذرا پیچھے جاکر کھڑی ہو گئی تا کہ آنند آسانی سے اسے دیکھ سکے۔ وہ کراہتے ہوئے ایک کہنی کے بل ذرا سا اٹھ گیا تھا دوسرے ہاتھ سے جگ کو منہ تک پہنچا کر غٹ غٹ پانی پی رہا تھا۔ نشہ کی زیادتی اور کمزوری سے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ پھر وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ کچے فرش پر پانی کی موٹی سی دھار آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے ایک طرف جانے لگی۔ آنند خمار آلود ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ وہ پانی کی دھار بہتے ہوئے دو گورے گورے پیروں سے ٹکرا گئی۔

آنند کی نظریں پاؤں سے اٹھ کر ساری تک پہنچیں۔ پھر ساری سے اٹھتے ہوئے سیتا کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔ سیتا کے دل کی دھڑکنیں بھی جیسے ٹھہر گئیں اوپر کا سانس اوپر ہی رہ گیا۔ وہ اونگھتی ہوئی آنکھوں سے چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا پھر آنکھیں بند کرلیں۔ سر کو جھٹک کر دھیرے سے ہنسا۔ پھر تکیہ پر گر کر بڑبڑایا۔ "سپنے ہیں سپنے........"

سیتا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ کبھی سپنا سچائی لگتا ہے۔ کبھی سچائی سپنا بن جاتی ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر اس پر جھک کر ہولے سے آواز دی' مگر اتنی سی دیر میں وہ پھر کھو گیا تھا۔

دروازے پر سے میٹھی دادا کی آواز آئی۔ "یہ صبح سے پہلے نہیں اٹھیں گے۔ بہت رات ہو چکی ہے۔ چلیے میں آپ کو پہنچا دوں۔"

"دادا' اس حالت میں ان کا خیال کون رکھے گا؟"

"آج تو میں ہوں۔ ویسے اسی حال کو پہنچنے کے لئے یہ ایسا کرتے ہیں۔"

وہ بڑے دکھ سے بولی۔ "یہ زندگی تو موت سے بری ہے۔"

"سیتا جی! جینا سب چاہتے ہیں۔ پر جینا آسان بھی تو نہیں ہوتا۔"

وہ دل بھاری کر کے باہر جانے لگی۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے پھر آنند کی طرف دیکھا۔ اسے چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ مگر جانا ضروری تھا۔ وہ آنکھوں



میں آنسو لئے دروازے سے باہر چلی گئی۔

☆======☆======☆

جب وہ اپنی کوٹھی کے احاطہ میں پہنچی تو گیارہ بج کر تیس منٹ ہو چکے تھے۔ کار کو پورچ میں روک کر وہ باہر آئی۔ ڈرائنگ روم روشن تھا اور برآمدے میں تاریکی تھی۔ اس تاریکی میں بھی اس نے بلراج کو پہچان لیا' بولی۔ "آپ اندھیرے میں کیوں کھڑے ہیں؟"

"کہاں سے آرہی ہو؟" بلراج کی آواز میں سختی تھی۔

وہ برآمدے میں پہنچ کر بولی۔ "ملکہ گنج سے کچھ ہی دوری پر غریبوں کی ایک بستی ہے' وہاں سے۔"

بلراج ہنس پڑا۔ "میں نے سوچا تھا کہ تم کچھ اور کہو گی۔ میری معلومات کے مطابق تمہاری گاڑی وہاں چار گھنٹے تک کھڑی رہی۔"

"جھوٹ وہ بولتے ہیں جن میں سچ بولنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔"

وہ برآمدے کو عبور کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں پہنچی۔ بلراج نے اس کے پیچھے آتے ہوئے پوچھا۔ "وہاں کیا کرنے گئی تھیں؟"

سیتا نے کوئی جواب نہیں دیا' فریج کھول کر گلاس اور ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی۔ گلاس کو پانی سے بھرا۔ پھر بوتل واپس رکھ کر پانی پینا چاہتی تھی کہ بلراج نے ہاتھ پکڑ لیا۔ "میری بات کا جواب دو۔"

وہ سرد لہجے میں بولی۔ "ہاتھ چھوڑیئے پانی پینے دیجئے۔"

"پہلے جواب دو۔ وہاں کنگالوں کی بستی میں کیا لینے گئی تھیں۔ یہاں تمہارے پاس کیا نہیں ہے؟ اتنی دولت اتنا سامان ہے کہ اس گھر میں آنے والی ہر عورت تم سے جلتی ہے۔"

اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا۔ پھر گلاس کو زور سے فرش پر پٹخ کر بولی۔ "دولت' دولت' دولت! تم مجھے کبھی یہ نہ بھولنے دینا کہ تم نے مجھے خریدا ہے۔ میں تمہیں یہ نہیں بھولنے دوں گی کہ تم مجھے خرید کر بھی نہیں خرید سکے۔ کیونکہ عورت اپنے دل سے بکتی ہے پیسے سے نہیں۔"

ایک ملازم چپکے سے آکر فرش پر سے شیشے کے ٹکڑے چننے لگا۔ بلراج نے پھر

پوچھا۔ ”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”میں اس وقت کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔ صبح پوچھ لیجئے گا۔“

بلراج نے کن انکھیوں سے ملازم کی طرف دیکھا پھر آگے بڑھ کر وہسکی کی بوتل اور گلاس نکالتے ہوئے پوچھا۔ ”پیو گی؟“

”آپ جانتے ہیں کہ میں صرف آپ کی سوسائٹی میں آپ کی بات رکھنے کے لئے منہ لگاتی ہوں۔“

وہ جانے لگی‘ اس نے کہا۔ ”یہ بھی کوئی بات ہے۔ میں پی رہا ہوں اور تم مجھے اکیلا چھوڑ کر جا رہی ہو۔“

”مجھے نیند آ رہی ہے آپ کمرے میں آ کر پی لیں۔“

وہ زینہ طے کرتے ہوئے اوپر جانے لگی۔ بلراج اسے غصہ سے دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو اس نے دانت پیس کر گلاس کو زور سے فرش پر دے مارا۔ ملازم ٹکڑے سمیٹنے کے بعد جا رہا تھا۔ پھر پلٹ کر فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ بلراج پاؤں پٹختا ہوا باہر چلا گیا۔

سنیتا نے اپنی خواب گاہ میں پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ پھر اس کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ اس نے اطمینان کی سانس لی کیونکہ بلراج غصہ کی حالت میں صبح تک کے لئے کوٹھی سے چلا جایا کرتا تھا۔ وہ پلنگ پر آ کر لیٹ گئی۔ چاروں شانے چت ہو کر چھت کو گھورنے لگی۔ سفید اجلی چھت پر آنند کا میلا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ وہ بیمار‘ تھکا ہوا اور زندگی سے خالی لگ رہا تھا۔

چند سال پہلے یہی آنند زندگی سے بھرپور تھا۔ تمام کالج میں اس سے زیادہ سرخ و سفید‘ صحت مند جوان کوئی نہ تھا۔ پڑھائی میں تیز اور کھیلوں میں سب سے آگے تھا۔ لڑکیاں اس کے پیچھے دیوانی تھیں۔ وہ سب سے مسکراتا ہوا ملتا تھا‘ مگر آگے بڑھ جاتا تھا۔ کسی کے ساتھ چلتا نہیں تھا۔

سنیتا نئی نئی کالج میں آئی تھی۔ وہیں مالتی سے دوستی ہوئی تھی۔ دونوں سہیلیاں کرکٹ میچ دیکھنے گئیں۔ آنند اپنے کالج کی طرف سے کھیل رہا تھا۔ سنیتا نے پہلی بار اسے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ جتنا خوبرو تھا‘ ویسے ہی اس کی چال تھی جب وہ بلا گھماتا تو اس کے جسم کے موڑ قابلِ دید ہوتے تھے۔ پتہ نہیں لڑکیاں کہاں پہنچ جاتی



ہوں گی‘ باجماعت سب کے منہ سے ہائے نکلتی تھی۔ سنیتا نے مالتی سے پوچھا۔ ”کون ہے یہ؟“

”تم نہیں جانتیں؟ یہ ہمارے کالج کا ہیرو ہے آنند!“

”اچھا کھیلتا ہے۔“

”تم نے ابھی کھیل ہی دیکھا ہے۔“

”کیا اس میں اور کوئی خاص بات ہے؟“

مالتی نے مسکرا کر کہا۔ ”کسی لڑکی سے پوچھ لو۔“

”تم بھی تو لڑکی ہو۔“

”میں نے کبھی چاند کو چھو لینے کی آرزو نہیں کی۔“

سنیتا دور آنند کی طرف دیکھنے لگی۔ ایک دن اس نے کالج کے ایک مذاکرہ میں آنند کو بولتے سنا۔ موضوع تھا۔ ”عورت کمزور کیوں ہے؟“ جب اس نے بولنا شروع کیا تو پورے ہال میں خاموشی چھا گئی۔ اس کی آواز میں جادو تھا۔ وہ ایسی روانی سے بولتا تھا کہ بولتے وقت رکتا نہیں تھا۔ رک کر سوچتا نہیں تھا یوں لگتا تھا جیسے اس کے آگے کتاب کھلی ہے اور وہ فر فر پڑھتا جا رہا ہے۔ سنیتا اوروں کی بات نہیں کہہ سکتی تھی‘ اس کی اپنی حالت یہ تھی کہ آنند کی آواز کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ اپنے دل کی دھڑکنیں بھی اترتی چڑھتی رہیں۔ جب وہ گھر واپس جا رہی تھی تو اس کے اندر عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس کے دل نے چپکے سے کہا۔ ”آنند! اب مجھے آنند (سکون) ملے گا۔“

ایک روز وہ مالتی کے ساتھ کالج کے باغیچہ میں بیٹھی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مالتی نے اسے کہنی سے ٹھوکا دے کر دھیرے سے پوچھا۔ ”اس لڑکی کو جانتی ہو؟“

سنیتا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے ہی ذرا فاصلے پر ایک نہایت ہی حسین لڑکی اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں نظر آئی۔ اس لڑکی کا قیمتی لباس‘ بالوں کا اسٹائل اور اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بہت ہی دولت مند باپ کی بیٹی ہے۔ آنند نے اس کے غرور کو خاک میں ملا دیا ہے۔“

”وہ کیسے؟“ آنند کی بات پر دل دھڑک گیا۔

مالتی نے کہا۔ ”میرے پتا بنک میں منیجر ہیں۔ اسی بنک میں آنند کے پتا کلرک

ہیں۔ دولت مند لوگ بنک کے منیجر سے اچھے تعلقات رکھتے ہیں۔ اسی تعلق کی بنا رانی کے پِتا میرے پِتا کے پاس آئے اور کہا کہ وہ آنند کے پِتا سے ان کا تعارف کرادیں۔ میرے پِتاجی نے آنند کے پِتاجی کو بلا کر تعارف کرایا۔ وہاں یہ بات کھلی رانی اپنے باپ کی لاڈلی بیٹی ہے۔ وہ آنند سے شادی کرنے کی ضد کررہی ہے۔ لاڈ بیٹی کی ضد سے مجبور ہو کر اس کا باپ آنند کو داماد بنانا چاہتا ہے۔"

سنیتا نے پھر ایک بار رانی کی طرف دیکھا۔ واقعی وہ مغرور اور ضدی لگتی تھی مالتی نے کہا۔ "آنند کے پِتا دوسرے دن آنند کو بنک میں لے آئے۔ رانی کے پِتا کہا۔ شادی میرا بیٹا کرے گا۔ آپ اس سے بات کرلیں۔ آنند اس کے ساتھ ایک طرف جاکر بیٹھ گیا۔ رانی کے پِتا نے اپنی دولت اور اپنے خاندان کی بڑائی کرنے بعد کہا میری بیٹی سے شادی کرکے تمہاری زندگی بدل جائے گی۔ میں لگ بھگ پانچ لا کا جہیز اور دو لاکھ روپے نقد دوں گا' مگر شادی کے بعد رانی تمہارے پاس نہیں' رانی کے پاس رہو گے۔"

سنیتا نے خوش ہو کر پوچھا۔ "آنند نے بکنے سے انکار کردیا ہوگا؟"

"ہاں' اس نے کہا۔ سیٹھ جی! آپ لوگ شادی کو بھی کاروبار سمجھتے ہیں۔ ا لئے بنک میں بیٹھ کر کاروباری انداز میں رشتہ طے کررہے ہیں۔ مجھے آپ کی بیٹی آپ کی دولت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں اپنی تعلیم اور اپنی صلاحیتوں سے ایک دن بڑا آدمی بنوں گا۔ آپ لوگوں کی سوچ بہت چھوٹی ہے اور میرے آدر بہت اونچے ہیں۔ آپ جاسکتے ہیں۔"

"آنند نے اچھا جواب دیا۔"

"مالتی نے پوچھا۔ "سونی! تم آنند کو چاہتی ہو؟"

وہ چونک گئی' پھر بولی۔ "آنند کو چاہنا اور بات ہے' آنند کو پانا اور بات ہے دیکھنا تو یہ ہے کہ وہ کسے چاہتا ہے۔"

اتنے میں رانی اپنی سہیلیوں کے ساتھ چلتی ہوئی ان کے قریب آگئی۔ سنیتا ا مالتی گھاس پر سے اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ رانی نے حقارت سے مالتی کو کہا۔ "تمہارا ا تنخواہ پانے والا ایک بنک منیجر ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم اپنی اس سہیلی کو میری ناکا داستان سنارہی ہو۔ مگر یاد رکھو' رانی ہارنا نہیں جانتی میں بہت جلد پورے کالج کو ا



تم دونوں کو بھی اپنی شادی کی دعوت دوں گی اور میری شادی آنند سے ہوگی۔ بچپن سے اب تک ایسی کوئی چیز نہیں ہے جسے میرے پِتاجی میرے لئے خرید نہ سکے ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ جس شان سے آئی تھی' اسی شانِ بے نیازی سے اپنی سہیلیوں کے ساتھ چلی گئی۔

ایک ماہ بعد لوہے والی گلی میں چچا کی لڑکی کی شادی تھی سنیتا شادی میں شریک ہونے گئی۔ چچا کا گھر چھوٹا تھا مہمانوں کو ٹھہرانے کے لئے آس پاس کے گھروالوں نے اپنا اپنا ایک کمرہ خالی کردیا تھا۔ سامنے والے مکان کے ایک کمرے میں ساری لڑکیوں نے قبضہ جمالیا۔ چاچی نے کہہ دیا تھا کہ جس کا کمرہ ہے وہ پانچ بجے آتا ہے۔ اس کے آنے سے پہلے کمرہ خالی کردیا جائے۔

اس کمرے میں کتابیں ہی کتابیں تھیں' اور اچھے سلجھے ہوئے مصنفوں کی کتابیں تھیں' اس سے کمرے میں رہنے والے کے اعلیٰ ذوق کا پتہ چلتا تھا۔ لڑکیاں وہاں تمام دن اودھم مچاتی رہیں ایک ہی غسل خانہ تھا۔ سب ہی باری باری غسل کرنے جاتی تھیں پھر کمرے میں آکر لباس پہننے کے بعد بارات میں شامل ہونے کے لئے بناؤ سنگھار میں مصروف ہوجاتی تھیں۔ سب سے آخر میں سنیتا کی باری آئی۔ اس وقت کمرے میں ایک لڑکی سنگھار کررہی تھی۔ باقی جاچکی تھیں۔ سنیتا غسل خانے میں چلی گئی۔

جب باہر آئی تو گورے بدن پر پانی کی بوندیں ہیرے کی طرح چمک رہی تھیں۔ سر پر بھیگے بالوں کو لپیٹنے والے تولیے کا ننھا سا مینار بنا ہوا تھا۔ وہ سر جھکائے غسل خانے سے باہر آرہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہی لڑکی کمرے میں ہوگی۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔ "پتہ نہیں یہ ہک کیوں نہیں لگ رہا ہے ذرا لگادو۔"

وہ اسی انداز میں سر جھکائے دوسری طرف گھوم گئی تاکہ اس کی پشت ہک لگانے والے کی طرف ہو۔ مگر کوئی اس کے پاس نہیں آئی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا تم نے نہیں سنا' میں کہہ رہی ہوں اسے لگادو۔"

جواب نہیں ملا۔ وہ غصہ دکھانے کے لئے پلٹ گئی پلٹتے ہی اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس کے سامنے آنند گم صم کھڑا ہوا تھا۔ وہ ایک دم سے بھاگتے ہوئے غسل خانے میں گئی پھر ایک دھڑاکے سے دروازہ بند کردیا۔ اس کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آنند اب بھی اسے دیکھ رہا ہے۔

اس کے ہاتھ پھر پشت پر گئے مگر ہاتھوں میں ہک تھرتھرانے لگا۔ کمبخت اپنی جگہ بیٹھ ہی نہیں رہا تھا۔ تماشہ دکھانا چاہتا تھا۔ سنا تھا جوانی دیوانی ہوتی ہے مگر وہ ہک دیوانہ ہو رہا تھا۔ آخر وہ جلمی تھوڑا ستانے کے بعد اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

سنیتا نے اطمینان کی سانس لی۔ تب دماغ نے سوچا کہ اس کے سامنے آنند کہاں سے آ گیا تھا؟ کیا یہ اسی کا کمرہ' اسی کا مکان ہے؟ ہائے تقدیر کہاں لائی اور کس حال میں اس کے سامنے لے آئی۔ مارے شرم کے اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ ابھی تک وہ سامنے کھڑا ہوا لگ رہا تھا اور اس کی حیا کہہ رہی تھی۔ "اب جاؤ بھی' کیوں ستا رہے ہو؟"

شاید وہ چلا گیا ہے۔ اسے چلے جانا چاہئے تھا۔ یہ سوچ سوچ کر شرم آ رہی تھی کہ وہ دیر تک گونگا بنا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتا رہا تھا۔ بے شرم کھانس کھنکار کر اپنی موجودگی ظاہر کر سکتا تھا کیا آدمی بت بن جانے کے بعد سب کچھ بھول جاتا ہے؟ اب تو وہ بت سے پھر آدمی بن گیا ہوگا۔

سنیتا نے باتھ روم کے دروازے سے کان لگا کر سنا۔ ادھر کمرے سے کوئی آہٹ سنائی نہیں دی۔ بالکل سناٹا تھا اس نے پلٹ کر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ پھر اسے اتنا ذرا سا کھولا کہ ایک ہی آنکھ کمرے میں دیکھ سکے اور جب اس کی ایک آنکھ نے دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ آنند اسی حالت میں گم صم کھڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ یوں ذرا سا اٹھا ہوا تھا جیسے کچھ کہتے کہتے رہ گیا ہو۔ یا جیسے ہاتھ اٹھا کر گزرے ہوئے نظارے کی بھیک مانگ رہا ہو۔ اس کی آنکھیں خلا میں تک رہی تھیں آنکھوں کے سامنے زندگی کی کتاب کا وہ حصہ کھلا ہوا تھا جس کے کنوارے صفحہ پر ابھی ایک سبق یاد کرنے کو ملا تھا۔ اس کی آنکھیں اسی سبق کو بار بار پڑھ رہی تھیں۔

سنیتا نے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر سوچا۔ "یہ ایسے کیوں کھڑے ہیں انہیں کیا ہو گیا ہے؟ یہ تو کبھی لڑکی کو آنکھ بھر کر نہیں دیکھتے تھے۔ ابھی یہ کہاں دیکھ رہے ہیں' کسے دیکھ رہے ہیں؟"

ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ساری عمر یہ ادھر رہتی وہ ادھر کھڑا رہتا۔ سنیتا نے بڑی ہمت سے کام لے کر آواز دی۔ "آپ باہر جائیں پلیز۔"

وہ پتھر کا بت بن گیا تھا۔ نہ بول سکتا تھا نہ سن سکتا تھا حتیٰ کہ پلکیں بھی نہیں جھپک



رہا تھا۔ جو دیکھ چکا تھا' اسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔ نظارے گم ہو جائیں تو کیا ہوتا ہے' دل کے فریم میں ان کی تصویر رہ جاتی ہے۔

دور کہیں سے بینڈ باجے کی آواز آئی۔ بارات آ رہی تھی وہ بے چین ہو گئی۔ اسے بارات میں شامل ہونا تھا۔ اس نے سوچا پھر اسے آواز دے۔ تب ہی دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ سنیتا کی ایک آنکھ نے دروازے کے پیچھے سے ایک جوان لڑکی کو دیکھا۔ وہ آنند کے پاس آ کر کہہ رہی تھی۔ "بھیا بارات آ رہی ہے آؤ ہم چھت پر سے دیکھیں۔"

بھیا پر سکتہ طاری تھا۔ بہن نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ "کہاں کھو گئے ہو؟"

"ایں۔" وہ ایک دم سے چونک گیا۔ کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد بولا "تت......... تم......... چھایا تم اور وہ.........."

"میں چھایا ہوں۔ تمہاری بہن ہوں' اور کون ہے؟ کسے پوچھ رہے ہو؟"

"ایں وہ۔" اس نے پھر کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا پھر باتھ روم کے دروازے پر نظریں پہنچیں تو سنیتا نے گھبرا کے دروازے کو بند کر دیا۔ دوسری طرف سے آنند کی آواز سنائی دی۔ "وہ......... وہ کوئی نہیں ہے۔ آؤ ہم بارات دیکھنے چلیں۔"

سنیتا نے تھوڑی دیر انتظار کیا پھر دروازہ کھول کر دیکھا تو کمرہ خالی تھا۔ وہ کمرے میں آئی۔ تیزی سے آگے بڑھ کر دیکھا۔ پھر کمرے کے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ وہ جوانی کا پہلا حادثہ تھا' جو آج تک یادوں میں جوان تھا اور بڑھاپے کی آخری سانسوں میں بھی جوان رہے گا کیونکہ یادوں کی عمر کبھی نہیں ڈھلتی۔

جب وہ خوب بن سنور کر چوڑے پاڑھ کی ساری پہن کر باہر آئی تو حیا کے مارے کٹی ہوئی تھی۔ خوشی سے سہمی ہوئی تھی کہ پھر سامنا ہو جائے۔ وہ باراتیوں کی بھیڑ میں نظر نہیں آیا۔ سنیتا نے پنڈال کے ایک گوشے میں جا کر اس مکان کی چھت کی طرف دیکھا۔ وہاں آنند کی بہن چھایا کچھ لڑکیوں کے ساتھ نظر آئی۔ آنند نہیں تھا۔ وہ شادی کی رسمیں دیکھتی رہی۔ لڑکیوں سے ہنستی بولتی رہی اور ہر جگہ اس کی نظریں اسے ڈھونڈتی رہیں پتہ نہیں وہ کہاں کھو گیا تھا۔

آخر اس نے چھایا سے دوستی کی۔ اپنا تعارف کرایا۔ وہ خوش ہو کر بولی۔ "میرے بھیا بھی اسی کالج میں پڑھتے ہیں۔ تم جانتی ہوگی۔ ان کا نام.........."

"آنند ہے۔" سنیتا نے کہا۔

چھایا فخر سے بولی۔ "میرے بھیا کو سارا کالج جانتا ہے۔ ایک دن سارا شہر ساری دنیا جان جائے گی۔ میرے بھیا میں بڑے گن ہیں۔ وہ بھی تو تمہیں جانتے ہوں گے؟"

وہ ایک دم سے شرما گئی۔ آنند نے ابھی اسے دیکھا تھا دیکھ لینے کو جان پہچان نہیں کہتے۔ پھر دیکھ لینا ایسا ہی ہوتا ہے کہ بغیر تعارف کے دور تک جان پہچان ہو جاتی ہے۔

چھایا حیرانی سے بولی۔ "ارے تم شرما رہی ہو۔" پھر اس نے سنیتا کی گردن میں بانہیں ڈال کر پوچھا۔ "بھیا سے کچھ ہے کیا؟"

وہ ایک دم سے گھبرائی۔ انکار میں سر جھٹک کر اس کی بانہوں سے الگ ہوئی۔ پھر وہاں سے تیز قدم اٹھاتے ہوئے شادی کے ہنگاموں میں گم ہو گئی۔ ناچ گانے کی محفل جمی ہوئی تھی۔ اس کا دل کہیں لگ نہیں رہا تھا۔ کبھی وہ سوچتی کہ آنند نے اسے کیوں دیکھا؟ آنکھیں کیوں نہ بند کر لیں؟ ہے بھگوان! جب دیکھ ہی لیا ہے تو کوئی اور نہ دیکھے اور کوئی دیکھے تو میں مر جاؤں۔

رات کے ایک بجے اس نے تھک ہار کر چاچی سے کہا۔ "نیند آ رہی ہے۔"

چاچی نے بتایا کہ مکان کے پچھواڑے بہت سی چارپائیاں بچھائی گئی ہیں۔ وہ وہاں جا کر سو سکتی ہے وہاں جانے کے لئے مکان کے اندر عورتوں کی بڑی بھیڑ تھی وہ مکان کے باہر دائیں طرف سے گھوم کر مویشی کے باڑے کے پاس سے جانے لگی۔ اچانک ہی پیچھے سے آنند کی آواز سنائی دی۔ "سنیتا جی!"

سنیتا کے پاؤں میں زنجیریں پڑ گئیں۔ اوپر کا سانس اوپر رہ گیا۔ اس نے اپنی دھڑکنوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ آواز ذرا اوپر اور قریب آئی۔ "آپ کا نام سنیتا ہے نا؟ میں نے آپ کو کالج میں دیکھا ہے پر لگتا ہے آج ہی دیکھا ہے۔ دیکھ لینے کی معافی چاہتا ہوں۔"

سنیتا نے شرم سے آنکھیں بند کر لیں۔ "آپ سوچتی ہوں گی کہ میں بے شرم ہوں۔ کمرے میں کیوں آیا اور بھول سے آیا تو شرافت سے کیوں نہ چلا گیا مم...... مگر میں کیا کروں۔ اس وقت میں' میں نہیں تھا۔ میرے پاؤں نہیں تھے جا سکتا۔ دماغ نہیں تھا کہ شرافت اور تہذیب یاد آتیں۔ دل بھی نہیں تھا۔ اگر تھا



دھڑکنا بھول گیا تھا۔ بس آنکھیں تھیں تب سے اب تک آپ ہی کو دیکھتی ہیں۔ زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا کہ کبھی ایسا کچھ نظر آتا ہے' جو آنکھوں سے کبھی نہیں بجھتا۔ میں آنکھیں پھوڑ لوں تب بھی یہ آنکھیں آپ کو دیکھتی رہیں گی۔"

آنکھیں پھوڑنے کی بات پر سنیتا گھبرا کر پلٹ گئی۔ بے اختیار اس کی آنکھوں کو دیکھا۔ پھر ان آنکھوں کو دیکھتے ہوئے دیکھ کر دوسری طرف گھوم گئی۔ وہاں سے جانے لگی۔ وہ بولا۔ "کل سے میں کالج میں صرف پڑھنے کے لئے نہیں' آپ کو پانے کے لئے بھی آیا کروں گا۔"

وہ خوشی سے لہرائی۔ پھر وہاں سے بھاگتی چلی گئی۔

دوسرے دن وہ مالتی کے ساتھ رکشے میں بیٹھ کر کالج کے سامنے پہنچی۔ آنند احاطہ کے بڑے پھاٹک کے پاس کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ وہ رکشے سے اتری تو اس نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے نمستے کہا۔ مالتی حیرانی سے کبھی سنیتا کو اور کبھی آنند کو دیکھنے لگی۔ سنیتا شرما رہی تھی۔ آنند نے کہا۔ "آپ حیران نہ ہوں۔ میں سنیتا جی کو پچھلے دن سے......"

سنیتا نے گھبرا کر اسے دیکھا تو وہ جلدی سے بات بدل کر بولا۔ "پچھلے جنم سے جانتا ہوں۔ آپ پچھلے جنم کو مانتی ہیں نا؟"

مالتی نے سنیتا کو گہری نظروں سے دیکھا پھر مسکرا کر بولی۔ "مان گئی۔ ویسے یہ سلسلہ پچھلے جنم سے چلا ہے تو اگلے جنم تک بھی چلے گا۔ مجھے تو صرف اپنی کلاس تک جانا ہے۔ وِش یو گڈ لک سونی!"

یہ کہتے ہی وہ آگے بڑھ گئی۔ سنیتا نے اسے آواز دی۔ اس کے پیچھے جانا چاہا۔ آنند نے راستہ روک کر کہا۔ "آگے جانے والوں کے پیچھے نہیں' ساتھ چلنے والوں کے ساتھ چلنا چاہئے۔ بائی دی وے' میں آپ کو تم کہوں؟"

وہ سر جھکائے اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ "کالج میں سب کیا کہیں گے؟"

"اسکینڈل شروع ہو گا۔"

"میں بدنام ہو جاؤں گی۔"

"میں تمہیں اپنا نام دوں گا۔"

"کالج میں سب کہتے ہیں کہ آپ کبھی کسی لڑکی کے ساتھ نہیں چلتے۔"

"ٹھیک کہتے ہیں۔ آج بھی میں کسی لڑکی کے ساتھ نہیں' اپنی زندگی کے سا
چل رہا ہوں۔ تم ہی بتلاؤ بھلا زندگی کے بغیر کوئی چل سکتا ہے؟"

وہ اندر سے جھوم گئی۔ اسے ایسے مرد کا پیار مل رہا تھا جس کی طرف ہر لڑ
دیکھتی تھی اور وہ اس کے سوا اب کسی کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی روز کالج کے ا
ایک لڑکے اور لڑکی سے لے کر پرنسپل تک یہ بات پہنچ گئی کہ پتھر پگھل گیا ہے۔ س
نے آنند کو کالج کے برآمدے میں' باغیچے میں اور کنٹین میں سینتا کے ساتھ دیکھا۔ آ
کی کاپیوں اور کتابوں پر سینتا کا نام تھا۔ ہونٹوں پر سینتا کی آرزو اور آنکھوں میں سینتا
سپنا تھا۔ کچھ لڑکے خوش ہوئے۔ کچھ لڑکیاں جل گئیں۔ رانی نے کالج آنا چھوڑ دیا۔

کچھ ہی دنوں میں کالج کی فضا جیسے بدل گئی۔ پہلے یہ اندازے اور پیش گوئیا
تھیں کہ رانی کسی نہ کسی دن آنند کو اپنی طرف جھکا لے گی' لیکن اب آنند کے سا
اس کا نام مٹ گیا تھا۔ سنجیدہ لڑکے لڑکیاں خوش ہو کر رانی کے متعلق کہتے تھے کہ
آئے دن نئے بوائے فرینڈ بناتی رہتی ہو' آنند اس کی طرف کبھی مائل نہیں ہو سک
تھا۔ کالج کے احاطہ کی دیوار پر کسی نے لکھا۔ "رانی کو راجہ نہ ملا۔ راجہ کو داسی
گئی۔

کنٹین کی دیوار پر لکھا تھا۔ "رانی کہاں ہو' تمہارے چاہنے والوں کے لئے
ادھار بند ہے۔"

کالج میں سب یہ جانتے تھے کہ رانی جس لڑکے پر مہربانی ہوتی تھی' اس کا کنٹین
بل ادا کر دیا کرتی تھی جس سے خوش ہوتی تھی' اسے اپنی کار میں لفٹ دیتی تھی کسی کی
جیب خرچ دیتی تھی اور کسی کے کالج کی فیس ادا کرتی تھی۔ بڑی مہربان تھی مگر ساری
مہربانیاں خوبرو اور اسمارٹ عاشقوں کے لئے تھیں۔ اب ان عاشقوں پر برا وقت آ گیا تھ
کیونکہ رانی کالج نہیں آ رہی تھی۔

ادھر سینتا اپنے آنند کی محبت میں ساری دنیا کو بھولی ہوئی تھی۔ اس کا پڑھنے میں
دل نہیں لگتا تھا۔ کتاب کھول کر بیٹھتی تو سامنے آنند کا چہرہ کھل جاتا۔ کانوں میں اس
کے میٹھے بول رس ٹپکانے لگتے۔ اس عمر میں محبت ایسے ہی تماشا دکھاتی ہے پتہ ہی نہیں
چلتا کہ دن اور رات کس طرح پر لگا کر اڑ جاتے ہیں۔ مالتی نے کہہ دیا تھا۔ "تم امتحان
میں ضرور فیل ہو گی کیونکہ محبت کا امتحان بڑے زور و شور سے پاس کر رہی ہو۔"



ایک روز اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی' وہ کالج نہیں گئی۔ اسے پورا یقین تھا کہ
آنند کسی بہانے اس کی خیریت دریافت کرنے آئے گا لیکن شام کو مالتی آئی۔ اس کا منہ
لٹکا ہوا تھا جیسے پرنسپل سے ڈانٹ سن کر آ رہی ہو۔ سینتا نے مسکرا کے پوچھا۔

"تمہاری صورت پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟"

"مالتی نے پوچھا۔ "آج تم کالج کیوں نہیں آئیں؟"

"صبح ہلکا سا بخار تھا۔ سر بھاری لگ رہا تھا اس لئے گھر سے نہیں نکلی۔"

مالتی نے سر جھکا کر کہا۔ "تمہیں کچھ روز تک کالج نہیں جانا چاہئے۔"

"مالتی! میں کالج کب جاتی ہوں۔ میں تو آنند سے ملنے.........."

وہ بات کاٹ کر بولی۔ "آنند سے ہی ملنے کو منع کر رہی ہوں۔"

"کیا مطلب؟" سینتا نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم مجھے آنند سے ملنے سے روک
رہی ہو؟"

"وہ پریشان ہو کر بولی۔ "سونی! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم سے کیسے کہوں؟"

"کیا کہنا چاہتی ہو' بے جھجک کہو۔"

"آج کالج میں سبھی کہہ رہے تھے کہ کل آنند اور رانی کی شادی ہونے والی
ہے۔"

"نہیں۔" سینتا ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ بیٹھی۔

مالتی نے کہا۔ "مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ میں نے کالج کی دیوار پر بھی یہی کچھ لکھا
دیکھا' تب بھی میں اسے لڑکیوں کی شرارت سمجھی لیکن رانی نے خود میرے پاس
آکر یہ شادی کا دعوت نامہ دیا۔ غرور سے بولی کہ یہ آنند کی طرف سے سینتا کو دے
دینا۔"

یہ کہتے ہوئے مالتی نے اپنی کاپی کے اندر سے ایک لفافہ نکالا۔ سینتا نے دھڑکتے
ہوئے دل سے لفافے کو دیکھا سہمے ہوئے انداز میں اسے لے کر کھولا۔ اندر سے ایک
خوبصورت سا دعوت نامہ نکلا۔ شادی کے اس کارڈ پر آنند اور رانی کا نام پڑھتے
ہی جیسے اس کے دل کی دھڑکنیں رک گئیں۔ ہاتھ سے وہ کارڈ چھوٹ کر گر پڑا۔ اس
پر سکتہ طاری ہو گیا تھا مسرتوں کے ہجوم میں کوئی اچانک ہی منہ پر تھپڑ مار دے تو سمجھ
میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ تھپڑ کھانے والا سوچتا ہی رہ جاتا ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ سکتے

طاری ہو گیا ہے۔

☆------☆------☆

صبح بلراج واپس آیا تو بیڈ روم میں قدم رکھتے ہی سنیتا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر جوتے اتارتے ہوئے بولا۔ "تمہاری آنکھیں نیند سے بھری ہوئی ہیں۔ لگتا ہے رات بھر جاگتی رہی ہو۔"

"ہاں جاگتی رہی۔"

"کوئی بھی ہو، کبھی اکیلا نہیں جاگتا۔ اس کے ساتھ اس کی سوچ جاگتی رہتی ہے رات بھر کیا سوچتی رہیں؟"

وہ بولی۔ "کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی شام سے سوچتا چلا جاتا ہے۔ صبح چونکتا ہے سوچتا ہے کہ تمام رات کیا سوچتا رہا۔ مگر اسے یاد نہیں آتا۔"

"تم بڑی خوبصورتی سے میرے سوال کو ختم کر دیتی ہو۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں تم کل آدھی رات تک اس آدمی کے مکان میں کیا کرتی رہیں؟"

"وہی جو ایک ہمدرد کو مجبور کے ساتھ کرنا چاہئے۔"

"اس کی مجبوری کیا تھی؟"

"یہ معلوم نہ کر سکی کیونکہ وہ ہوش میں نہیں تھا۔"

"تو پھر اس کے ہوش میں آنے کے بعد یہاں آتیں۔" وہ جھلا گیا۔

"آپ کی فکر تھی کہ دیر ہو گی تو آپ بھی ہوش میں نہیں رہیں گے۔"

وہ بستر سے اٹھ کر باتھ روم کی طرف جانے لگی۔ بلراج نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ وہ چپ رہی کیونکہ اس نے ہاتھ چھڑانے کے لئے شادی نہیں کی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد جب وہ نہا دھو کر باتھ روم سے باہر آئی تو بلراج جا چکا تھا۔ کام والا آدمی تھا۔ ایک کام نکال کر دوسرے کام پر چلا جاتا تھا۔ سنیتا نے ناشتہ کیا اور چائے پینے کے دوران سوچا۔ "مجھے آنند کے پاس نہیں جانا چاہئے اور اگر چاہئے تو کیوں جانا چاہئے؟ یہ تو وہی آنند ہے جس نے اچانک ہی بے قصور مجھے ٹھکرایا تھا آج اس کا سینہ زخموں سے چھلنی ہے تو میں کیا کروں؟"

میٹھی دادا نے اسے بتا دیا ہو گا کہ سنیتا اسے پارک سے گھر تک لائی تھی اور اس کے پاس بیٹھی رہی تھی۔ اب وہ انتظار کر رہا ہو گا۔ اس نے پھر سوچا۔ "میرا ا



بھی کر رہا ہو گا اور شرمندہ بھی ہو گا کہ کس طرح میرا سامنا کرے گا۔ آہ! عورت کی یہی کمزوری نہیں جاتی، مرد ایک بار نادم ہو تو ہزار بار کی ٹھوکروں کو بھول جاتی ہے۔ میں جاؤں گی۔"

وہ یوں بھی کل سے بے چین تھی۔ رہ رہ کر ایک سوال دماغ میں چبھتا تھا کہ رانی نے اسے کیوں ٹھکرا دیا؟ وہ اور بھی کتنی ہی باتیں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس کی بہن چھایا اور اس کے پتا جی کہاں ہیں؟ وہ بے یار و مددگار کیسے زندگی گزار رہا ہے؟ وہ شراب پیتا ہے یا اپنے ہی خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔

وہ بیڈ روم میں آئی، لباس تبدیل کیا۔ پرس اور کار کی چابی لی۔ پھر وہاں سے چل پڑی۔ چالیس منٹ کے بعد اس کی کار گھوڑا چھاپ بیڑی والے بورڈ کے پاس رکی۔ کتنے ہی ننگے بھوکے بچوں نے گاڑی کو گھیر لیا۔ مرد عورتیں اپنی اپنی جھونپڑیوں سے باہر آ کر اسے دیکھنے لگے۔ ایک عورت نے بچوں کو ڈانٹ کر کہا۔ "بھاگو نہیں تو میٹھی دادا ابھی آ جائیں گے۔"

دادا کا نام سنتے ہی سب ڈر کر بھاگ گئے۔ اس عورت نے سنیتا سے کہا۔ "آپ وہی ہیں، جو کل آئی تھیں؟ کیا آنند بابو کو بلاؤں؟"

"نہیں، میں خود چلی جاؤں گی۔" وہ کار کو لاک کر کے مکان کے دروازے پر پہنچی، دروازہ کھول کر اندر آئی تو پتہ چلا کہ غریبوں کے ہاں دن کو بھی اندھیرا ہوتا ہے۔ کسی کی آواز سنائی دی۔ "بائیں ہاتھ کی طرف سوئچ ہے۔"

یہ آنند کی آواز ہو سکتی تھی کیونکہ کمرہ آنند کا تھا۔ ورنہ جو آواز سنیتا نے بھی سنی تھی۔ وہ آج سے مختلف تھی۔ پہلے آنند کی آواز زندگی سے بھرپور ہوتی تھی۔ آج اس آواز میں زندگی کی صرف تھرتھراہٹ رہ گئی تھی۔

سوئچ پر انگلی رکھتے ہی کمرہ روشن ہو گیا۔ آنند دیوار سے سر ٹکائے بستر پر نیم دراز تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نظریں ملتے ہی اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ سنیتا اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ یوں پڑا تھا جیسے حالات نے اسے اٹھا کر پٹخ دیا ہو۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی اور گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ مشکل سے یقین آتا تھا کہ وہ آنند ہے۔

وہ دھیرے سے بولا۔ "میٹھی دادا تمہارے لئے کرسی رکھ گئے ہیں۔ بیٹھو گی

نہیں؟"

"آئی ہوں تو ضرور بیٹھوں گی۔"

"مجھے پورا یقین نہیں تھا کہ تم آؤ گی۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے' وہ خواب سا لگتا ہے۔"

"میں تو ہمیشہ حقیقت رہی۔ تم نے مجھے خواب بنا دیا۔ میں تمہیں طعنے دینے نہیں آئی ہوں۔ بس تمہاری بات کا جواب دیا ہے۔"

وہ چارپائی کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ کل سرہانے کی میز پر اس کی تصویر تھی۔ آج نہیں تھی۔ وہ چپ رہی۔ اُدھر وہ سر جھکائے شرمندہ سا نظر آ رہا تھا۔ آخر سیتا نے پوچھا۔ "بہت پینے لگے ہو؟"

"آں۔" اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر بات بدل کر پوچھا۔ "تم کیسی ہو؟"

"اچھی ہوں۔"

"بہت بدل گئی ہو۔ تمہارے چہرے پر گزرے ہوئے وقت کی پرچھائیاں ابھر آئی ہیں۔"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ جھریاں ہیں۔"

"اس لئے نہیں کہتا کہ یہ جھوٹ ہو گا۔ زندگی نے تمہیں وقت سے پہلے بوڑھی بنانے کی کوشش کی بڑھاپے کے آثار چہرے پر لا کے' مگر تمہیں بوڑھی نہ بنا سکی۔"

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"یہی نا کہ میں زیادہ کیوں پیتا ہوں؟ اس کا جواب دینے کے لئے مجھے پھر پینا پڑے گا۔"

"آج بوتل نظر نہیں آ رہی ہے۔"

"میشی دادا نے سختی سے منع کیا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ دیوی کے سامنے نہیں پینا چاہئے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "اچھا میشی دادا نے مجھے دیوی بنا دیا ہے۔ تم دادا کے ساتھ کب سے ہو؟"

"ایک سال سے۔ لگتا ہے صدیوں سے اس کال کوٹھری میں سزا پا رہا ہوں۔"

وہ رانی کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی مگر ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے



پوچھا۔ "چھایا کیسی ہے؟"

"مر گئی۔"

سیتا کو جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ آنند اپنی بہن سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اس کے لئے "مر گئی" جیسے الفاظ استعمال نہیں کر سکتا تھا' وہ بولی۔ "کیا سچ کہہ رہے ہو؟ مگر یہ کیسے ہوا؟ اس کی جینے کی عمر تھی؟"

"ہاں جینے کی عمر تھی۔ پر کیوں مر گئی یہ نہیں جانتا۔ ایک صبح مجھے تار ملا تھا۔"

"تم گئے تھے؟"

"گیا تھا۔ ایک نیلی لاش دیکھی۔ پتہ چلا کہ اس نے خودکشی کی ہے۔"

"چھایا نے خودکشی کی؟ یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"جو دیکھا ہے' وہی کہہ رہا ہوں۔ اس کے سسرال والوں۔نے یہی بتایا۔ سچ کیا تھا' یہ چھایا بتا سکتی تھی اور وہ نہیں رہی تھی۔"

تھوڑی دیر تک سوگوار خاموشی رہی' پھر سیتا نے پوچھا۔ "تمہارے پتا جی کہاں ہیں؟"

وہ ہنسا پھر بولا۔ "آگرے' پاگل خانے میں۔ بیٹی کی خودکشی برداشت نہ کر سکے۔"

سیتا کے اندر سے آنسوؤں کی ایک لہر اٹھی اور وہ اپنی آنکھوں کو بھیگنے سے نہ روک سکی۔ ان کے درمیان پھر خاموشی چھا گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد آنند نے کہا۔ "اب تمہارے پاس ایک ہی سوال بچا ہے اور وہ یہ ہے کہ رانی کہاں ہے؟"

وہ آنسو پونچھنے لگی۔ اب اس میں کوئی سوال کرنے کا حوصلہ نہیں رہا تھا' وہ بولا۔ "رانی یہیں دہلی میں ہے یہاں کبھی کبھی یہ دیکھنے آتی ہے کہ میں مر گیا ہوں یا تھوڑی زندگی اور رہ گئی ہے۔ ہاتھی مرے تو سوا لاکھ کا۔ میں ایک لاکھ کا ہوں۔ میری موت کے بعد رانی کو بیمہ کمپنی سے ایک لاکھ روپے ملیں گے۔" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا' پھر بولا۔ "اور میں ہوں کہ مرتے مرتے بھی زندہ رہ جاتا ہوں۔"

وہ ہنستے ہوئے چارپائی سے اٹھ گیا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ اس کی ہنسی کے پیچھے آنسوؤں کا سیلاب ہے جو لوگ رونا نہیں چاہتے وہ کمال خوبی سے آنسوؤں کو ہنسی میں چھپا لیتے ہیں۔ وہ اٹھ کر بولا۔ "بیٹھو سونی! میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ جلدی سے باہر چلا گیا۔ سنیتا اس کے ایک لفظ سونی میں ڈوب گئی۔ کبھی وہ کتنے پیار سے اسے سونی کہا کرتا تھا۔ اب ایسا کہنے کا کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن اکثر رشتے ٹوٹنے کے بعد بھی محبت سے ادا ہونے والا وہ لفظ دماغ میں کہیں چھپا رہتا ہے۔ آنند رونے اور ہنسنے کے درمیان بے خیالی میں اسے سونی کہہ گیا تھا۔

دس منٹ کے بعد واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم رانی کے بارے میں بہت کچھ معلوم کرنا چاہتی ہو گی اور میں شراب کا سہارا لئے بغیر کچھ نہیں بتا سکوں گا۔ یا تو تم کچھ نہ پوچھو' یا پھر تھوڑی سی پی لینے دو۔"

"میں پوچھوں گی۔"

اس نے بوتل کھول لی۔ میز پر سے گلاس اٹھا کر اسے بھرا۔ بوتل ایک طرف رکھی' پھر ایک ہی سانس میں کئی گھونٹ پی گیا۔ اس کے بعد بولا۔ "یوں پیتے دیکھ کر کیا تمہیں مجھ سے ڈر نہیں لگتا؟"

"تم خود سے ڈرے ہوئے ہو' تم سے کون ڈرے گا۔"

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔"

اس نے گلاس خالی کر دیا۔ پھر دوسری بار اسے بھرتے ہوئے بولا۔ "تم رانی کے بھائی رمیش کو جانتی ہو' وہ بھی ہمارے کالج میں پڑھتا تھا؟"

"ہاں' مجھے یاد ہے۔ اس کے پاس بادامی رنگ کی کار ہوتی تھی۔"

"میری کہانی اسی سے شروع ہوتی ہے۔ رمیش خوبصورت بھی تھا اور دولت مند بھی۔ لڑکیاں اس کے آگے پیچھے گھومتی تھیں اور وہ کسی کو مایوس نہیں کرتا تھا۔ میں آج تک نہیں جان سکا کہ میری سیدھی سادی معصوم سی بہن اس کے فریب میں کیسے آ گئی۔ جب مجھے اس بات کا علم ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ چھایا ماں بننے والی تھی۔ پتا جی خود کشی کرنے والے تھے۔ میں نے کسی طرح انہیں روکا۔ کوئی دوسرا بھائی ہوتا تو چھایا کا گلا گھونٹ دیتا۔ مگر میں اس کی معصوم صورت اور بھیگی ہوئی آنکھیں دیکھ کر پگھل جاتا تھا۔

میں نے ایک دن رمیش سے ملاقات کی۔ اس کے گھر جا کر اسے انسانیت کا واسطہ دیا' وہ بولا۔ "میں چھایا سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ آپ میرے پتا جی کو



راضی کر لیں وہ اس کمرے میں ہیں۔"

میں اس کمرے میں گیا تو سیٹھ رادھے شیام نے کہا۔ "آؤ آنند! کیا رشتہ جوڑنے آئے ہو؟"

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "ہماری عزت خاک میں ملنے والی ہے۔ آپ میری بہن کو بہو بنا لیں۔ میں آپ کا احسان............"

وہ بات کاٹ کر بولے۔ "احسان کاہے کا۔ میں بھی تو ایک دن تمہارے پاس رشتہ جوڑنے گیا تھا۔ تم نے میری آفر کو ٹھکرا دیا تھا مگر میں کم ظرف نہیں ہوں۔ تمہاری بہن کو اپنی بہو بنا سکتا ہوں' لیکن تم اس رشتہ کے لئے رانی کو راضی کر لو۔ وہ اس کمرے میں ہے۔"

میں رانی کے کمرے میں گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی خوش ہو کر آگے بڑھی پھر مجھ سے لگ کر بولی۔ "ہائے کتنے دنوں بعد تمہیں دیکھا ہے اب ہم کبھی جدا نہیں ہوں گے۔"

میں اسے اپنے سے الگ نہیں کر سکا میری بہن کو ڈوبنے سے وہی بچا سکتی تھی۔ میں نے کہا۔ "میں تم سے ایک التجانے آیا ہوں۔"

"میں جانتی ہوں' میں تمہیں اور تمہارے خاندان کو بدنامی سے بچانے کے لئے چھایا کو اپنی بھابی بنا سکتی ہوں۔"

میں نے خوش ہو کر پوچھا۔ "سچ!"

"بالکل سچ۔ مگر تم جانتے ہو تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ کالج میں اور اپنی سوسائٹی میں میری بھی بڑی بدنامی ہو رہی ہے کیا تم مجھے بدنامی سے نہیں بچاؤ گے؟"

"میں تمہیں بدنامی سے کیسے بچا سکتا ہوں؟"

"بڑی آسانی سے۔ کالج کی دیواروں پر لکھوا دو۔ سنیتا آؤٹ رانی اِن۔ اس کے بعد کل تم دولہا بن کر میرے پاس آؤ۔ پرسوں رمیش دولہا بن کر تمہاری بہن کو یہاں لے آئے گا۔"

میں اس کی یہ شرط سن کر چکرا گیا۔ انکار کا لفظ میری زبان سے نہیں نکل رہا تھا۔ میں انکار کر کے رانی کی بے عزتی کرتا تو وہ کب ہماری عزت رکھتی؟ پھر بھی میں فیصلہ کرنے کی مہلت چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ "میں اپنے پتا جی سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ بولی۔ "ضرور مشورہ کرو۔ میں انتظار کروں گی۔"

میں اپنے گھر واپس آیا۔ وہاں محلے والے جمع تھے' پتہ چلا کہ میرے پتاجی کا دماغ چل گیا ہے۔ میں ان کے سامنے گیا تو وہ مجھے پہچان نہ سکے۔ چھایا کو بھی بھول گئے۔ پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگے۔ ایک طرح سے وہ خوش نصیب ہیں کیونکہ پاگل پن کے باعث وہ بیٹی کی بے شرمی اور بدنامی کے خوف سے نجات پا گئے ہیں۔"

اب میں رانی کے سامنے جاکر انکار نہیں کرسکتا تھا۔ تمہارے سامنے آکر م نہیں دکھا سکتا تھا۔ سوچا مالتی کے پاس جاکر سارا دکھڑا سنا دو۔ پھر سوچا میرا دکھڑا اس تمہارے دکھ میں اضافہ ہوگا۔ اتنا ہی معلوم ہوجائے کہ میں ہرجائی ہوں اور میں نے سے منہ موڑ کر رانی سے شادی کرلی ہے تو تم غصے اور نفرت سے میری بے وفائی برداشت کرلوگی۔ محبت سے میری مصیبتوں کا حساب کروگی۔ تو ساری عمر صدمے اٹھاؤ گی محبت میں رہ رہ کر صدمات کی لہریں اٹھتی رہتی ہیں۔ نفرت سے یہ دریا اتر جاتا ہے۔

بہر حال میں نے رانی سے شادی کرلی۔ شادی کے بعد معلوم ہوا کہ وہ مجھے دیوانگی کی حد تک چاہتی ہے ہمیشہ میرے جسم کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر تعریفیں کرتی تھی۔ آتے جاتے اٹھتے بیٹھتے مجھے یوں گھورتی تھی جیسے مجھے پاکر پالینے کا یقین کر رہی ہو۔ سہاگ کی پہلی رات کو میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ اس رات مجھے رانی کا دوسرا روپ نظر آیا وہ ایک طرح سے ایسی دماغی مریضہ تھی جو اپنے ہوش و حواس کھو دیتی تھی۔ لوگ تو محبت میں پاگل ہوتے ہیں۔ وہ پاگل پن میں محبت کرتی تھی۔ اس نے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح میرے لباس کو تار تار کردیا۔ لانبے ناخنوں سے میرے جسم پر خراشیں ڈالی دیں۔ میں حیران اور پریشان تھا کہ کہاں آکر پھنس گیا ہوں۔ اس کے لئے جیسے یہ کوئی بات نہیں تھی۔ وہ خوب جی بھر کر مجھے سزائیں دینے کے بعد سوگئی سہاگ کی اس جہنمی رات اس صبح تک نہ سوسکا۔

صبح اٹھ کر اس نے بڑی لجاجت سے معافی مانگی تو میں نرم پڑ گیا۔ وہ غسل کر کے لئے باتھ روم میں گئی۔ میں نے سوچا اب نفرت اور پچھتاوے سے کچھ نہیں گا۔ شادی ہو ہی گئی ہے تو مجھے اس رشتے کو فراخدلی سے نباہنا چاہئے میاں بیوی ا دوسرے کی خامیوں اور کوتاہیوں کو برداشت کرنے اور انہیں دور کرنے کی کوش کرتے ہوئے خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں میں بہت دیر تک سوچتا رہا............"



☆======☆======☆

سنیتا نے کن انکھیوں سے دیکھا وہ کبھی کبھی گلاس کو منہ سے لگا کر پیتا تھا پھر یوں لیف سے آنکھیں بند کرلیتا تھا جیسے زہر پی رہا ہو۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولا۔ "پھر بہت را وقت گزر گیا۔ میں اسے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا میرے جسم پر راشیں پڑتی رہتی تھیں اور میں برداشت کرلیا کرتا تھا۔ وہ بھی میری ہر بات ماننے ل۔ نئے دوست بنانے اور رات کو کھانے سے پہلے شراب پینے کی برائیاں بچپن ہی ے اسے اپنے ماحول سے ملی تھیں۔ میں اسے ان باتوں سے نہ روک سکا۔ مگرہاں اب ہ میرا حکم مان کر رات کو کبھی گھر سے باہر نہیں جاتی تھی۔ فضول خرچی سے باز آگئی ھی۔ میری موجودگی میں غرور کرنا بھول جاتی تھی۔ ملازموں کے ساتھ بھی نرمی سے یش آتی تھی۔

اس کے پتاجی بڑے کاروباری آدمی تھے۔ انہوں نے بیٹی کو مشورہ دیا کہ میری زندگی کا بیمہ کرایا جائے۔ میں مروں گا تو رانی کو ایک لاکھ روپے ملیں گے۔ میرے زندہ رہنے تک یہ ایک لاکھ روپے بچت کے طور پر محفوظ رہیں گے۔ ڈاکو دولت لوٹ کرلے جاتے ہیں۔ کاروبار میں رقمیں ڈوب جاتی ہیں لیکن بیمہ کی رقم محفوظ ہوجاتی ہے۔ کبھی برے وقت میں یہ رقم رانی کے کام آئے گی۔"

میں رانی کو جانتا ہوں کہ وہ میرا بڑا خیال رکھتی تھی اس نے اپنے باپ سے کہا۔ "پتاجی! میری بیمہ پالیسی دو لاکھ روپے کی ہے۔ میں بیمہ کمپنی کو اپنی تحریری وصیت دوں گی کہ میرے مرنے کے بعد دو لاکھ روپے کے حقدار صرف میرے پتی آنند ہوں گے۔"

رانی کے پتاجی کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ مگر وہ بیٹی کی ہر بات برداشت کرلیتے تھے۔ بہرحال ایک لاکھ روپے میں میرا بھی بیمہ ہوگیا۔ میں اپنی رام کہانی کو پوری تفصیل سے نہیں سنا رہا ہوں۔ صرف اہم واقعات سنانا چاہتا ہوں۔ شادی کے ایک ماہ بعد ہی رانی نے یہ خوشخبری سنائی تھی کہ میں ایک بچے کا باپ بننے والا ہوں۔ اس طرح میری نظروں میں رانی کی محبت اور اہمیت بڑھ گئی تھی۔ اس کے پتا سیٹھ رادھے شیام نے اپنے ایک مل کی ذمہ داری مجھے سونپ دی تھی۔ میں صبح سے شام تک کام میں معروف رہتا تھا۔ ایک شام گھر سے فون آیا کہ رانی کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ زچگی کا

وقت قریب ہے۔ اس لئے اسے ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔

ادھر میں کچھ دنوں سے یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ ابھی آٹھ مہینے بھی پورے نہیں ہوئے' زچگی کا وقت کیسے قریب آ رہا ہے؟ جب میں ہسپتال پہنچا تو وہ ایک بچے کو جنم دے چکی تھی۔ میں اس کے کمرے کی طرف جانے لگا اسی وقت ایک شخص اس کمرے سے نکل کر جانے لگا وہ قد آور' صحت مند اور خوش لباس تھا۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور چلا گیا۔ میں کمرے میں گیا۔ رانی بہت خوش تھی۔ بچی اس کے پاس لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اوپری دل سے رانی کو بدھائی دی بچی کو پیار کیا۔ وہ شخص مجھے کھٹک رہا تھا۔ میں زیادہ دیر وہاں نہ بیٹھ سکا۔ گھر واپس آیا تو ایک آیا رانی کے لئے کھانے پینے کا سامان لے جا رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا "تمہاری مالکن کب ہسپتال گئی تھیں۔"

"صبح آپ کے جانے کے بعد۔"

"مجھے اتنی دیر سے شام کو اطلاع کیوں دی گئی؟"

وہ خاموش رہی۔ مگر اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے میں نے محبت اور نرمی سے پوچھا' تو اس نے کہا۔ "مالکن نے منع کر دیا تھا۔ مجھ سے کہا کہ آپ مل میں مصروف ہوں گے۔ پھر خود ہی ایک جگہ فون کیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک آدمی خوبصورت سی گاڑی لے کر آیا۔ وہ اسی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر ہسپتال چلی گئیں۔"

"اس آدمی کا حلیہ بتاؤ۔"

"وہ لمبا تڑنگا سا تھا۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں۔ اس کے بازوؤں پر ریچھ کی طرح لمبے لمبے بال تھے۔ چوڑی پیشانی اور بڑی بڑی سرخ آنکھیں تھیں۔"

سینتا چونک کر سیدھی بیٹھ گئی۔ "کیا تمہاری آیا نے یہی حلیہ بتایا تھا؟"

آنند نے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں۔ مگر تم کیوں چونک گئیں؟ کیا اسے جانتی ہو؟"

"شاید۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "تم بولو پھر کیا ہوا؟"

"میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ وہی تھا جو ہسپتال میں رانی کے کمرے سے نکل رہا تھا۔ مجھے سوچنا پڑا کہ ایسے وقت رانی نے مجھے کیوں نہیں بلایا۔ ایک غیر آدمی کے ساتھ بچے کو جنم دینے کیوں گئی۔ میرے دماغ نے سمجھایا' وہ غیر نہیں تھا وہی اس بچی کا باپ



گا۔

مجھے یاد ہے اس رات میں نے بہت پی۔ اتنی پی کہ ساری دنیا میرے چاروں ں گھومنے لگی۔ میرے سسر سیٹھ رادھے شیام گھر میں آئے تو میں پی رہا تھا۔ انہیں تے ہی ہنسی آ گئی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "سیٹھ جی! نواسی مبارک ہو۔"

وہ خوش ہو کر بولے۔ "تمہیں بیٹی مبارک ہو۔"

میں نے ایک جھٹکے سے اٹھ کر گلاس کو فرش پر پٹخ دیا۔ پھر چیخ کر کہا۔ "اس کا مجھ سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا۔"

وہ یہ گالی برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر میرا گریبان پکڑ لیا۔ پھر وڑتے ہوئے بولے۔ "نشے میں یہ مت بھولو کہ حرامی بچے بڑے گھروں کی لڑکیاں نہیں کرتیں ہیں۔ ایسا ننگے بھوکے گھروں میں ہوتا ہے۔ بھول گئے ہو تو اپنی بہن کو ر لو۔"

یہ کہہ کر انہوں نے مجھے صوفہ پر دھکا دیا اور وہاں سے چلے گئے۔ انہوں نے ایسی کہہ دی تھی کہ میں اسے یاد رکھ کر رانی کی بدچلنی کا گلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ایک مرد غیرت کے مطابق اس سے لڑ نہیں سکتا تھا۔ اسے طلاق نہیں دے سکتا تھا اور اس کا باپ بننے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے صبر کر لیا۔ رانی ہسپتال سے واپس آئی تو میں اس سے ناراض رہا۔ رات دوسرے بیڈ روم میں سونے کے لئے چلا گیا۔ وہ محبت سے بولتی رہی۔ مجھے سمجھاتی رہی۔ مجھے اس بچی پر بھی پیار نہیں آ رہا تھا۔ پہلے تو میں باپ بننے کے خیال سے ں رہتا تھا۔ اپنی اولاد ہو تو بڑا پیار آتا ہے۔ اس بچی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ مگر اس ں سے میرا دل کٹنے لگا تھا کہ رانی نے مجھ پر دوسرے مرد کو ترجیح دی۔ اس کے ھ ہسپتال گئی اور اس کی بچی کو جنم دیا۔ اس سے زیادہ میری توہین اور کیا ہو سکتی ا۔

کچھ روز کے بعد میں مل کے ایک کام سے بمبئی چلا گیا۔ ایک ہفتہ کا کام تھا۔ میں ین ہفتے لگا دیئے۔ رانی کی دنیا میں واپس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ مگر مل کی ذمہ ی ایسی تھی کہ میں زیادہ عرصہ باہر نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک دن واپس آیا تو رانی گھر نہیں تھی۔ میں خواب گاہ میں گیا۔ بچی بھی نہیں تھی۔ میں نے ملازم سے پوچھا۔

"رانی کہاں ہے؟"

وہ بتا نہ سکا کیونکہ مالک نوکروں کو اپنا پروگرام بتا کر نہیں جاتے میں نے

"بچی کہاں ہے؟"

"صاحب! وہ تو مرگئی۔"

ایک ساعت کے لئے مجھے چپ لگ گئی۔ ملازم بتا رہا تھا کہ بچی کو سردی ا
تھی بڑا علاج ہوا۔ مگر وہ زندہ نہیں رہ سکی۔ پچھلی رات کو اس دنیا سے اٹھ گئی۔
وہ معصوم میری اولاد نہیں تھی۔ مگر مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں شراب کی بوتل او
لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ رانی کی زندگی میں آکر میں نے یہی سیکھا تھا
پر کوئی صدمہ گزرے تو شراب کے سہارے غم غلط کیا جائے مگر اتنے عرصے ت
رہنے کے بعد معلوم ہو رہا تھا کہ شراب غموں کا علاج نہیں ہے۔ آدمی اسے دوا
شروع کرتا ہے اور یہ زہر کی طرح رگ رگ میں اتر جاتی ہے۔ اگر شراب یا
نشہ آور چیزوں سے دکھوں کا علاج ہو جاتا تو آج دنیا میں کوئی دکھی نہ ہوتا۔
کروں یہ منہ کو ایسی لگی ہے کہ بے حیا عورت کی طرح پیچھا نہیں چھوڑتی۔

رانی اس رات بارہ بجے آئی۔ میں نے گاڑی کی آواز سن کر تھوڑی د
کیا پھر دروازے کے پاس آکر پردے کو ذرا سا ہٹا کر دیکھا۔ رانی اسی شخص
اوپر کی منزل میں پہنچ کر خواب گاہ کی طرف جا رہی تھی۔ میں جہاں کھڑا تھا
کے سامنے خواب گاہ کا بند دروازہ تھا۔ جواب اندر سے بند ہو چکا تھا۔ میں میز
آکر بھرے ہوئے گلاس کو اٹھا کر غٹاغٹ پینے لگا۔

گلاس خالی ہوتے ہی میں نے ایک جھٹکے سے اسے میز پر رکھا۔ میرا دماغ
تھا کمرے کے در و دیوار میرے چاروں طرف سرک رہے تھے۔ میں لڑکھڑا
سے پھر دروازے کے پاس آیا۔ پردہ ہٹایا سامنے خواب گاہ کا دروازہ منہ چڑا
تھا۔ "پی آؤٹ پرمی اِن.........."

میں نے غصہ سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ پردے کو ایک جھٹکے سے ہٹا کر با
نہیں جانتی تھی کہ میں بمبئی سے واپس آگیا ہوں۔ میں پاؤں پٹختا ہوا خواب گا
جانے لگا۔ ارادہ تھا کہ دروازے کو توڑ کر اندر گھس جاؤں گا۔ اس بدمعاش
سے پکڑ کر لاؤں گا اور زینے سے نیچے لڑھکا دوں گا۔ پھر خوب جی بھر کے را



ں گا۔ میں دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ میرے کانوں میں کچھ آوازیں
۔ میں دروازے پر گھونسے مارنا چاہتا تھا مگر ہاتھ رک گیا۔ اندر سے اس شخص
کراہنے کی آواز سنائی دی۔ یوں لگا جیسے وہ قتل کیا جا رہا ہو اور تڑپ تڑپ کر
تے ہوئے زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو۔ میں ٹھنڈا پڑ گیا۔ ایک چور سی خوشی ہوئی کہ
رقیب اپنی سزا پا رہا ہے۔ اچھا ہے کمبخت مر جائے۔ میں نے اس دروازے کو ہاتھ
لگایا۔ اپنے کمرے میں واپس آگیا۔

اور ایک گلاس بھرنے کے بعد میں آہستہ آہستہ پینے لگا۔ اپنے صبر کو آزمانے لگا۔
بار بار پردے کے پاس جاتا تھا۔ پھر واپس آجاتا تھا تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میں نے
ہٹایا تو سامنے خواب گاہ کا دروازہ کھل چکا تھا۔ مجھے وہ شخص نظر آیا اس کے
دوں پر ریچھ کی طرح گھنے بال تھے۔ وہ مضبوط اور صحت مند تھا۔ مگر اس وقت
حال سا تھا۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ چہرے اور گردن پر خراشیں نظر
یں اور بھی بدن پر نشانات ہو سکتے تھے۔ مگر اس لئے نظر نہیں آئے کہ اس وقت
چادر لپیٹ لی تھی۔ تاکہ نیچے ڈرائنگ روم سے گزرتے وقت کوئی ملازم اس کے
ے ہوئے لباس کو نہ دیکھ سکے۔

وہ چلا گیا۔ میں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ کسی کا کچھ بگاڑنے کے لئے اپنے پاس کچھ
ت ہوتی ہے میری بیوی مجھے کمزور بنا چکی تھی۔ وہ شخص ڈاکو بن کر نہیں دعوتی بن
ر آیا تھا۔ میں اسے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ شراب کی بوتل سے آخری گھونٹ پینے کے
رمیں کمرے سے باہر آیا۔ زینے کے پاس سے گزر کر خواب گاہ کے دروازے پر
۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ زیرو پاور کی روشنی میں رانی نظر آئی۔ وہ بستر پر اوندھے منہ
ا رو رہی تھی۔ مجھے اس کے روپ پر تعجب ہوا وہ رونے کے دوران کبھی بستر پر
نے مارتی تھی اور کبھی خود کو گالیاں دینے لگتی تھی۔

میں کچھ بول نہ سکا۔ میں نے پہلے کبھی کسی عورت کو اپنی بے حیائی پر روتے
ئے نہیں دیکھا تھا۔ بے حیائی پر ہنسی آتی ہے عیش و عشرت کے دروازے کھلتے ہیں۔
رگی میں رنگینیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جوانی کا بھاؤ بڑھتا ہے۔ کوئی ذاتی نقصان نہیں ہوتا
ف شرم جاتی ہے۔ اصل چیز شرم ہے یہ مر جائے تو پھر رونا نہیں آتا۔ مگر وہ رو رہی
ا۔ خود کو بدکار کہہ رہی تھی۔ زہر کھا کر مرجانا چاہتی تھی پھر خود کو کوستی تھی کہ مر

بھی نہیں سکتی۔ کیونکہ زندگی بہت پیاری لگتی ہے۔

میں سر جھکا کر خواب گاہ کے دروازے سے ہٹ گیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا
اسی کمرے میں واپس آگیا۔ میں مرد ہوں میں اسے بالوں سے گھسیٹ کر
جوتے مار سکتا تھا۔ اس کے منہ پر تھوک کر اسے طلاق دے سکتا تھا لیکن مرد ایسے
ہوتے ہیں کہ جو شرمندہ ہو اسے اور شرمندہ نہیں کرتے۔ اسے اور سزا نہیں
جسے ضمیر کی عدالت میں قدرت سزا سنا رہی ہو۔ میں بستر پر آکر گر پڑا مجھے نیند
آسکتی تھی۔ اس کی بے حیائی چین لینے نہیں دے رہی تھی' بس ایک ہی بات دما
گونج رہی تھی کہ میں وہ گھر اور شہر چھوڑ کر دور بہت دور بھاگ جاؤں۔

میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ دراصل میں نے رانی کو معاف نہیں کیا تھا۔ بلکہ
کرنے والا بڑا پن مجھ میں نہیں تھا۔ سسرال میں رہنے والے کا بڑا پن ہوتا ہی
میرے سسر سیٹھ رادھے شیام نے شادی سے پہلے ہی یہ دھمکی دے دی تھی کہ
نے شادی کے بعد رانی کو کوئی دکھ دیا یا اسے چھوڑنا چاہا تو اس کا بھائی میری بہ
ٹھوکریں مار کر اسے سہاگن سے ابھاگن بنا دے گا۔ ہر دروازے کا رکھوالا کتا کاٹ
ہے مگر سسرال میں رہنے والا کتا بھونک بھی نہیں سکتا۔

میں تمام رات انگاروں کے بستر پر لوٹتا رہا۔ صبح آنکھ لگنے والی تھی۔ اتنے
رانی آگئی۔ اسے ملازم نے بتا دیا تھا کہ میں پچھلی شام ہی سے گھر میں ہوں۔ وہ
جھکائے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ گردن اکڑا کر سینہ تا
آسکتی تھی۔ مگر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ چہرہ بھیگا ہوا
بکھرے ہوئے تھے۔ گناہ کے بوجھ سے گردن جھکی ہوئی تھی۔ وہ تھوڑی د
دروازے پر کھڑی ہچکچاتی رہی پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پلنگ کے پائنتی آئی۔
گھٹنے ٹیک دیئے۔ پھر دونوں ہاتھوں سے میرے پاؤں کو تھام لیا۔ اس کے بعد
چہرے کو میرے تلوؤں سے رگڑ رگڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں چپ چاپ لیٹا رہا۔ وہ روتی رہی۔ اس کے آنسوؤں سے میرے
پاؤں تر بتر ہوتے رہے۔ آخر وہ بولی۔ "آپ خاموش رہیں گے تو میں مر جا
آپ مجھے مارتے کیوں نہیں؟ مجھ پر تھوکتے کیوں نہیں؟ آپ جتنی چاہیں مجھے
مگر مجھے چھوڑ کر جانے کا خیال دل میں نہ لائیں۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکوں



میں چاروں شانے چت لیٹا ہوا' چھت کو گھورتا ہوا بولا۔ "میرے بغیر شادی سے
پہلے ہی تمہارے یار تھے' آج بھی ہیں کل بھی رہیں گے۔ اپنے آنسو پونچھ لو۔ جب
تک میری بہن کو تمہارے بھائی نے سہاگن بنا کر رکھا ہے' تب تک میں تمہیں چھوڑ کر
نہیں جاؤں گا۔"

"نہیں' آپ بہن کی خاطر نہیں میری محبت کی خاطر میرے ہیں۔ بے شک میں
نے آپ کو حاصل کرنے کے لئے رمیش کے ذریعے گھٹیا چال چلی۔ مگر اب آپ کو پتی
بنا کر عقل آئی ہے کہ آپ ہی سے میرا سہاگ ہے میری عزت ہے۔ ہر عورت کی طرح
میں بھی دنیا کو دکھا رہی ہوں کہ میرا ایک چاہنے والا ہے؟"

"صرف ایک چاہنے والا؟"

وہ ایک لمحہ چپ رہی پھر بولی۔ "میں نادان نہیں ہوں۔ سمجھتی ہوں کہ جب
میری جوانی ڈھل جائے گی میرا حسن پھیکا پڑ جائے گا تو جوانی سے اس بڑھاپے تک ایک
آپ ہی چاہنے والے ہوں گے باقی تماشائیوں کی طرح اپنے اپنے گھر لوٹ جائیں
گے۔"

"کیا ایسی بات کہتے ہوئے تمہیں شرم آرہی ہے؟"

"ہاں۔ آرہی ہے۔ مگر شرماؤں گی تو آج بھی اپنے اندر کی بات زبان پر نہ
لاسکوں گی۔ آپ نہیں جانتے کہ میں چودہ برس کی عمر سے اپنے اندر اپنی برائیوں سے
لڑتی آرہی ہوں۔ جب میں بچی تھی تو اپنے ماں باپ کی جوانی میں بڑے گھناؤنے تماشے
دیکھے انہیں دولت کا ایسا نشہ تھا کہ وہ کسی برائی کو برائی نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے
کبھی یہ نہیں سوچا کہ ہم جوان ہوں گے تو ہمارا دماغ مر چکا ہوگا۔ اخلاق تہذیب اور
شرم و حیا جیسی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔

اور ایسا ہی ہو رہا ہے۔ جب میرے اندر بے شرمی کی آندھی چلتی ہے تو میں
بھگوان کو بھول جاتی ہوں۔ ایک جھنجلائی ہوئی عورت بن جاتی ہوں۔ میں اپنے ماں
باپ کا اپنے ماحول کا اور اپنی سوسائٹی کا منہ نہیں نوچ سکتی' اس لئے جو سامنے ہوتا
ہے' اس کے جسم پر خراشیں ڈال دیتی ہوں۔ ایسی وحشت سے گزرنے کے بعد جب
مجھے اپنی بے شرمی کا احساس ہوتا ہے تو میں بلک بلک کر رونے لگتی ہوں۔ کتنی ہی بار
بڑی بڑی قسمیں کھائیں کہ اب ایسا نہیں کروں گی۔ مگر جب آندھی آتی ہے اور گزر

جاتی ہے تو میں رونے بیٹھ جاتی ہوں۔ پندرہ برس کی عمر سے یہی ہو رہا ہے۔ آج میں چوبیس برس کی ہوں ایک طویل عرصہ کی ناکام کوششوں کے بعد یہ سمجھ میں آیا ہے کہ میری یہ وحشت اور پاگل پن میری زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوگا۔

میں کہاں ہوں؟ اور مجھے کیا ہو جاتا ہے؟ یہ میں نے آپ کو بتا دیا پہلے میں نے خود کو سدھارنا چاہا۔ ناکام ہوتی تو پوجا کے وقت بھگوان سے مدد مانگی بھگوان بھی میرا علاج نہ کر سکے۔ آج آپ سے بنتی کر رہی ہوں کہ مجھے پیار سے سمجھائیے۔ میں پھر غلطی کروں تو مجھے ماریئے اتنا ماریئے کہ میرے جسم سے کھال الگ ہو جائے۔ تب بھی نہ مانوں تو میری جوانی کو آگ لگا دیجئے۔ مرد بنئے مجھے دولت مند باپ کی بیٹی نہیں' اپنی داسی سمجھئے۔ میری بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک دیجئے۔ میں اُف نہیں کروں گی۔ اپنے سہاگ کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ آپ کے ہاتھوں سے میرا انت (آخر) ہوگا تو میرے سارے پاپ ڈھل جائیں گے۔"

اس نے ساری باتیں کہہ دیں۔ جب کہنے کے لئے کچھ نہ رہا اور رونے کے لئے صرف آنسو رہ گئے تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ اب تک میرے قدموں سے لپٹی آنسوؤں سے بھیگ رہی تھی۔ میں نے آہستگی سے اپنے پاؤں کھینچ لئے۔ بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بھیک مانگتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں کمرے سے جانے لگا۔ جانے کے دوران پلٹ کر اسے نہیں دیکھا۔ کمرے سے باہر آگیا۔ گھوم کر اسے دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے پیچھے آئے گی اور وہ آرہی تھی۔

میں نے خواب گاہ میں پہنچ کر فریج کو کھولا۔ اندر وہسکی کی ٹھنڈی ٹھنڈی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک بوتل کھول کر گلاس کو بھر لیا۔ وہ میرے پیچھے آکر کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے مسلسل دو چار گھونٹ پینے کے بعد ایک لمبی سانس لی پھر کہا۔ "میں تمہیں پیار سے سمجھا سکتا ہوں مگر تمہیں مار مار کر تمہاری جان نہیں لے سکتا۔"

"کیا آپ قانون سے ڈرتے ہیں؟"

میں نے ایک جھٹکے سے فریج کو بند کیا۔ پھر پلٹ کر دہاڑتے ہوئے کہا۔ "نہیں میں ابھی تمہیں قتل کر کے ہنستے ہنستے پھانسی پر چڑھ سکتا ہوں۔ میں بزدل نہیں ہوں۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ بزدل بنا دیا گیا ہوں۔ حالات نے بنا دیا ہے۔ میں تمہیں مار کر قانون



کے ہاتھوں مروں گا۔ ادھر میری بہن بے یار و مددگار ہوگی۔ تمہارا بھائی اسے ساری عمر سزائیں دیتا رہے گا۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ میں تمہیں اب تک کیوں برداشت کر رہا ہوں؟"

یہ کہہ کر میں نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ پھر فریج کو کھول کر دوسری بار گلاس بھرنے لگا۔ وہ بولی۔ "میں نے اس کمرے میں ایک خالی بوتل دیکھی ہے۔ یہاں بھی آپ پی رہے ہیں۔ آپ پہلے اتنی نہیں پیتے تھے۔"

میں نے گھوم کر اس کے بازو کو سختی سے دبوچ لیا۔ میرے ایک ہاتھ میں بھرا بھرا جام تھا۔ دوسرے ہاتھ میں بھرا بھرا بازو' میں اسے کھینچتا ہوا پلنگ کے پاس لایا۔ پھر اسے بستر پر دھکیلتے ہوئے بولا۔ "یہاں لیٹی رہو۔ میں پیتا رہوں گا۔ تمہارے حالات سننے کے بعد مجھے تم سے نفرت نہیں رہی۔ ہمدردی ہو گئی لیکن میں ہمدرد بن کر دو ہی صورتوں میں تمہیں برداشت کر سکتا ہوں۔ یا تو پاگل ہو جاؤں۔ یا پھر بے غیرت بن جاؤں۔ پاگل بننا میرے بس میں نہیں ہے۔ ہاں یہ شراب مجھے بے غیرت بنا سکتی ہے سنا ہے نشے میں ڈوب کر آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اپنی بیوی کے کیریکٹر کو بھی.........."

وہ بستر پر گری ہوئی تھی۔ سر اٹھا کر التجا آمیز لہجے میں بولی۔ "آپ پیار و محبت سے مجھے گمراہی سے بچا سکتے ہیں۔"

"میں ہوش میں رہا تو ایسا کروں گا۔ ابھی مدہوش ہونے سے پہلے یہ بتا دوں کہ دنیا میں آج تک جتنے پیغمبر اولیا اور بھگت آئے وہ ایسے ہی لوگوں کو راہ راست پر لاسکے' جو راستی پر آنے کا عزم کرتے تھے۔ جو اپنے طور پر کوشش نہ کرے' اسے کوئی بھی آسمانی کتاب گمراہی سے نہیں بچا سکتی۔ میں بیچارہ تمہیں سدھارنے والا کون ہوتا ہوں۔"

یہ کہتے ہی میں نے پینا شروع کر دیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن میں پیتا ہی چلا جا رہا ہوں۔ کئی بار نشے میں دھت ہو کر میں گندی نالیوں میں گر پڑا۔ مجھے گھن نہیں آتی۔ غلاظت کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ میں ایک مدت سے رانی کے ساتھ حرامی رشتوں کے گڑھوں میں گرا ہوا ہوں۔"

اتنا کہہ کر آنند تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس کی بوتل میں شراب کے

چند گھونٹ رہ گئے تھے۔ اس کی رام کہانی سن کر سنیتا کا دل اندر سے تڑپ رہا تھا۔ نے آنند کے ہاتھ سے بوتل چھین کر کہا۔ "اب تم نہیں پیو گے۔"

وہ نشے میں ہاتھ نچا کر بولا۔ "تم بولتی ہو تو نہیں پیوں گا مگر آگے کچھ نہیں سنا گا۔"

"آگے بولنے کے لئے اس کا سہارا نہ لو آنند۔"

"سونی! میری زندگی میں تو زہر ہی زہر بھرا ہوا ہے۔ زہر نہیں پیوں گا تو زہر اگلوں گا۔"

"اوہ آنند پلیز' ایک وقت تھا کہ تم میری ہر بات مان لیتے تھے۔"

وہ بڑے دکھ سے بولا۔ "پہلے ہر بات مان لیتا تھا جب سے میں نے بے وفائی ہے تب سے جی چاہنے لگا کہ کبھی تم ملو تو تم پر جان دے دوں۔ شاید اسی طرح میری ا ایک غلطی کی تلافی ہو سکے۔"

"کیا تم میرے لئے جان دے سکتے ہو؟"

"ہاں ابھی دے سکتا ہوں۔"

"تو ابھی میری یہ بات مان لو کہ پینا چھوڑ دو۔"

"اب میں شراب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"زندہ نہ رہ سکو تو یاد کر لینا کہ میرے ہی کہنے پر جان دے رہے ہو اور ایک لعنت سے نجات پاتے ہوئے جان دے رہے ہو۔"

"سونی! جان دینا آسان ہے۔ شراب چھوڑنا مشکل ہے۔"

"جو کام مشکل ہے' وہی میرے لئے کرو۔"

"اوہ۔" آنند نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ سنیتا نے کہا۔ "اب میں کس کی دھرم پتنی ہوں کسی کی عزت ہوں۔ اب میں تمہاری کوئی نہیں ہوں اس کے باوجو کبھی کوئی تھی۔ اگر ماضی زندہ ہے اور گزرے ہوئے لمحوں کی خوشبو باقی رہتی ہے تو بولو اس خوشبو کو آئندہ بھی باقی رکھو گے یا نالی اور گٹر کی غلاظتوں میں جانے دو گے؟"

وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں تم سب سے جیت نہیں سکتا۔ رانی نے مجھے پینا سکھایا تم شاید جینا سکھا دو۔ میں کوشش کروں گا۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "اب بتاؤ رانی کہاں ہے؟"



وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "شاید میں تمہیں بتا چکا ہوں وہ اسی شہر میں ہے۔"

"کیا تم نے اسے چھوڑ دیا؟"

"ہاں۔" وہ بوتل کی طرف دیکھنے لگا۔

سنیتا نے بوتل کو اپنی کرسی کے پیچھے چھپا کر رکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں؟"

"وہ میری برداشت سے باہر ہو گئی تھی۔ میں مانتا ہوں کہ وہ کافی عرصہ تک خود کو نبھالنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس نے اپنی سوسائٹی میں اٹھنا بیٹھنا چھوڑ دیا۔ وہ صرف رے ساتھ شاپنگ یا تفریح کا پروگرام بناتی تھی۔ ورنہ گھر میں رہتی یا مل میں آکر رے پاس بیٹھ جاتی تھی کچھ ہی عرصہ میں اس نے میرا دل جیت لیا۔

یہ کچھ عرصہ کی بات ہے پھر رفتہ رفتہ وہ اپنی نفسیاتی بیماری کی طرف لوٹنے لگی۔ ارے گھر میں کوئی ہٹا کٹا جوان ملازم نہیں رہ سکتا تھا۔ کچھ روز کام کرتا تھا پھر بھاگ تا تھا۔ میں یہ سمجھتا رہا کہ آج کل ملازموں کا بھاؤ بڑھ گیا ہے۔ انہیں دوسری ٹھیوں میں زیادہ پیسے ملتے ہیں۔ اس لئے چلے جاتے ہیں۔ میں نے ایک شام مل سے پس آکر نئے ملازم کو آواز دی۔ وہ نہیں آیا۔ میرے دل نے کہا کہ وہ بھی بھاگ گیا ہے۔ میں اسے دیکھنے کے لئے کوٹھی کے پیچھے سرونٹ کوارٹر میں گیا۔ کوارٹر خالی تھا۔ اپنے سامان کے ساتھ جا چکا تھا۔ خالی کمرے میں اس کا صاف ستھرا لباس پڑا ہوا تھا۔ ں نے اسے اٹھا کر دیکھا تو وہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ جیسے کسی سے جھگڑا ہوا ہو اور ابل نے اس کے لباس کو تار تار کر دیا ہو۔"

آنند ذرا چپ ہوا۔ پھر بولا۔ "اور سنو گی۔ ایک بار میں دودھ والے پہلوان کی ان کے پاس سے گزر رہا تھا کار روک کر میں نے آواز دی کیا بات ہے پہلوان جی! آج ں دودھ دینے کیوں نہیں آتے؟ وہ دکان سے اٹھ کر میرے پاس آیا۔ کار کی کھڑکی کے پاس جھک کر بولا۔ "باؤ جی! آپ دولت میں کم نہیں ہیں۔ ہم لڑنے مرنے میں کم نہیں ہیں۔ میں صاف صاف بول دوں۔ آپ کی گھر والی پاگل ہے اسے پاگل خانہ بھیج دیجئے۔"

میں نے برا مان کر پوچھا۔ "یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"یہ بکواس نہیں ہے میں دودھ دینے گیا تھا۔ وہ بولیں رسوئی گھر میں دودھ لے

جا کر رکھ دو۔ میں رسوئی گھر میں دودھ رکھ کر لوٹنے لگا تو وہ میرے جسم کو چھو کر
پہلوانی کرتے ہو؟ میں نے سینہ تان کر کہا۔ "ہاں جی!" بس اتنا کہتے ہی اچانک اس
میرے منہ پر پنجہ مارا۔ یہ دیکھو ابھی تک ناخنوں کے نشان باقی ہیں۔"

اس نے دائیں طرف گھوم کر اپنا چہرہ دکھایا۔ غصہ سے میرا خون کھولنے لگا
بولا میں پہلوان ہوں اگر اکھاڑہ ہوتا تو اس پاگل کو اٹھا کر پٹخ دیتا۔ مگر میں نے سو
آپ کی گھروالی نے شور مچایا کہ میں اس کے گھر میں گھس کر پاپ کے لئے آیا ہو
جیل بھی جاؤں گا۔ بدنام بھی ہو جاؤں گا۔ بس جی اپنی عزت کے خیال سے بھاگ کر
ہوں۔ اب تو میرا باپ بھی ادھر نہیں جائے گا۔"

اس کی باتیں سن کر شرم سے میرا سر جھک گیا۔ میں اندر ہی اندر غصہ سے
رہا تھا۔ اس روز میں دیر تک کار میں بیٹھا گھومتا رہا۔ رات کو دیر سے گھر پہنچا۔
نے محبت سے شکایت کی۔ "میں آپ کے انتظار میں بھوکی بیٹھی ہوں۔"

میں نے تڑاخ سے ایک زوردار طمانچہ رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گئی اور ا
صوفہ پر گر پڑی۔ میں نے چیخ کر کہا۔ "تم ایسی بدکار عورت ہو کہ تم پر ہاتھ اٹھا
ہوئے شرم آتی ہے۔"

وہ صوفہ سے اٹھی پھر دوڑتی ہوئی آ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ "میں بدکار نہیں ہو
آپ کی قسم سنبھل رہی ہوں۔"

"جھوٹی قسم مت کھاؤ۔ مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔ ہٹ جاؤ میرے پا
سے۔"

وہ فرش پر بیٹھ کر میرے قدموں سے لپٹ گئی۔ روتے ہوئے کہنے لگی۔ "مجھ
بڑی سے بڑی قسم لے لیجئے میں سنبھل رہی ہوں۔ کبھی کبھی بہک جاتی ہوں۔ برسوں
بیماری محبت کی ایک خوراک سے دور نہیں ہو سکتی۔ آپ نفرت نہ کریں۔ مجھے آپ
محبت ملتی رہے گی تو رہی سہی برائیاں بھی ختم ہو جائیں گی جہاں اتنا برداشت کیا ہے
اور برداشت کر لیں۔ میں آپ کے قدموں میں رہ کر ہی ایک سچی عورت بن
ہوں۔"

ہاں میں نے بہت برداشت کیا تھا۔ اسے صحیح معنوں میں ایک عورت بنانے
لئے کچھ اور برداشت کر سکتا تھا۔ میں یہ الزام نہیں لینا چاہتا تھا کہ مرد عورت کو



رات پر آنے کا موقع نہیں دیتے میں نے پھر اسے معاف کر دیا۔

کچھ عرصہ بعد سیٹھ رادھے شیام کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ اس کے کاروبار کے ایک
حصہ دار نے کچھ ایسا چکر چلایا کہ سیٹھ رادھے شیام کو مقروض بنا کر ان کی ملوں کا تنہا
مالک بن بیٹھا۔ رمیش کا کچھ بنک بیلنس تھا۔ وہ میری بہن کو ساتھ لے کر دوسرے
شہروں میں کاروبار کے لئے چلا گیا۔ میں نے ایک جگہ ملازمت کر لی سیٹھ جی کا قرض ادا
کرنے میں کوٹھی اور کار بھی فروخت کر دی گئی تھیں۔ تقدیر نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ ہم
کرائے کے مکان میں رہنے لگے تھے۔ مجھے ملازمت سے اتنا مل جاتا تھا کہ ہم تین وقت
کھا کر اچھا پہن بھی سکتے تھے۔ ایسے برے وقت میں رانی نے وفاداری کا ثبوت دیا۔
اس نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ میری آمدنی کے مطابق سادہ لباس پہننے اور سادہ کھانا
کھانے لگی۔

میں نے کہا۔ "ہم نے برے وقت کے لئے بیمہ کرایا تھا کیوں نہ میں اپنے بیمہ کی
رقم نکال کر کوئی کاروبار شروع کروں۔"

وہ میری گردن میں باہیں ڈال کر بولی۔ "عورت پر برا وقت تب آتا ہے' جب
اس کا مرد ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ رہ گئی ہماری یہ زندگی تو ہمارے دیش میں کروڑوں
لوگ ایسی زندگی گزارتے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔ ہم بھی خوش رہیں گے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر زندگی میں اونچا اٹھنے کی بھی کوشش کرنا چاہئے ہمارے
اس بیمہ کی رقم ہے کیوں نہ ہم آمدنی بڑھانے کے لئے کاروبار کریں۔"

"آپ کو کاروبار کرنے کے لئے میں رقم دوں گی۔"

"کہاں سے دو گی؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "جب میں نے پتا جی کی کوٹھی اور جائیداد کی نیلامی کی
خبر سنی تو اپنے تمام زیورات لاکر میں لے جا کر رکھ دیئے تھے۔ وہ کم از کم ڈیڑھ لاکھ
روپے کے زیورات ہیں۔ آپ انہیں بیچ کر جو کاروبار کرنا چاہیں کریں۔"

مجھے اس کی دانائی پر خوشی ہوئی۔ میں نے حیرانی سے کہا۔ "عورتیں سونے کے
زیورات کے لئے جان دیتی ہیں اور تم یہ سب کچھ مجھے دے رہی ہو۔ دیکھو زیورات
سے عورت کا روپ بڑھتا ہے۔ جب ہمیں بیمہ کی رقم مل سکتی ہے تو............"

وہ میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "آپ اس رقم کی بات نہ کریں۔ وہ میں نے

اپنی اور آپ کی زندگی کا بیمہ نہیں بلکہ محبت کا بیمہ کرایا ہے۔"

"کیا مطلب؟ میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔"

"میں سمجھاتی ہوں پاجی آپ کی زندگی کا بیمہ اس لئے کرا رہے تھے کہ ان ایک لاکھ روپے پر انکم ٹیکس نہ لگتا۔ وہ رقم محفوظ رہتی اور آپ کی موت کے بعد مل جاتی۔ آپ کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا۔ میری محبت نے اسے گوارا نہیں کیا۔ میں نے ا بیمہ پالیسی میں یہ وصیت منسلک کردی کہ میری موت کے بعد صرف آپ کو دوا روپے ملیں گے۔ آنند! محبت کیا ہے؟ محبت یادوں کی ایک بیمہ پالیسی ہے کہ مرجائیں تو ہمارے چاہنے والوں کو یادوں کا خزانہ ملے گا۔ میری اور آپ کی بیمہ پالی دراصل محبت کا معاہدہ ہے کہ آپ کے بعد مجھے اور میرے بعد آپ کو اتنا تحفظ حاص ہوگا کہ کسی کے محتاج نہیں رہیں گے۔ اس لئے ہم وہ رقم نہیں نکالیں گے۔ میں آ کے ساتھ فاقے کروں گی۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنوں گی اور ایک دن اپنی محبت اپنی و اپنی خدمت گزاری اور دو لاکھ روپے آپ کے لئے چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ یہ سوچ کتنی خوشی ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد آپ کو بہت یاد آؤں گی۔"

اس روز مجھے رانی پر اتنا پیار آیا کہ میں نے دل کی گہرائیوں سے اسے گ لگالیا۔ مرد ہو یا عورت یہ آدم زاد سمجھ میں نہیں آتے کبھی ان کا روپ اتنا مقدس ہو ہے کہ ان کے سامنے نظریں عقیدت سے جھک جاتی ہیں کبھی ان کا روپ اتنا گھناؤ ہوتا ہے کہ ان پر تھوکنے کو جی چاہتا ہے۔ رانی بھی کبھی نور تھی، کبھی نار تھی۔ کبھ تھوکنا پڑتا تھا، کبھی چاٹنا پڑتا تھا۔

میں رانی کے زیورات بیچنا نہیں چاہتا تھا، مگر اس نے خود ہی بیچ کر ایک لاکھ بیر ہزار روپے میرے آگے رکھ دیئے۔ میں نے لینے سے انکار کیا۔ وہ بولی۔ "یہ اچھ بات ہے مرد کو جراً عورت کے زیورات نہیں بیچنے چاہئیں۔ میں آپ کو قرض د رہی ہوں۔ بلکہ آپ کے کاروبار کی شریک بن رہی ہوں۔ رقم میری، محنت آپ کی نقصان میں اور فائدہ میں دونوں برابر کے شریک رہیں گے۔"

میں نے کامیابی کے یقین کے ساتھ وہ رقم لی اور کاروبار شروع کیا۔ اس کے جی کے مل میں کام کرتے کرتے اتنا تجربہ ہوگیا تھا کہ مجھے اپنے کاروبار میں زیادہ نقصا نہیں اٹھانا پڑا۔ شروع میں رقم لگتی گئی۔ منافع نظر نہیں آیا۔ پھر آمدنی شروع ہوئی



رانی خوشی سے ناچنے لگی۔ بے شک اس نے میرا بڑا ساتھ دیا تھا۔ اب وہ گھر گرہستی والی ہوگئی تھی گھر سے باہر اب اس کا کوئی دوست نہ کوئی سہیلی تھی۔ میں ہی اس کا سب کچھ تھا۔

کاروبار کے سلسلہ میں مجھے اکثر دہلی سے باہر جانا پڑتا تھا۔ اب وہ میرے بغیر نہیں رہتی تھی۔ مگر مجبوری تھی میں اس سے وعدہ کرکے جاتا تھا کہ فلاں دن، فلاں وقت اس کے سامنے حاضر ہو جاؤں گا اور میں وعدے کے مطابق ٹھیک اسی دن، اسی وقت آکر اسے محبت سے سمیٹ لیتا تھا۔ ایک بار میں بمبئی گیا۔ اس سے وعدہ کرکے گیا کہ بدھ کی شام کو واپس آجاؤں گا لیکن اتفاق سے کام اتنی جلدی ہوگیا کہ میں دو دن پہلے ہی سوموار کی شام کو واپس آگیا۔

وہ گھر میں نہیں تھی۔ گھر کی دو چابیاں تھیں۔ ایک میرے پاس بھی ہوتی تھی۔ میں دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ وہ گھر کو بڑے سلیقے سے سجا کر رکھتی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی دل بے اختیار کہتا تھا "گھر پیارا گھر" مگر وہ گھر والی اس روز نہیں تھی۔ میں خواب گاہ میں آیا۔ پلنگ کے سرہانے والی میز پر میری ایک تصویر مسکرا رہی تھی۔ تصویر کے اطراف تازہ پھول بچھے ہوئے تھے۔ ان پھولوں کی تازگی سے پتہ چلا کہ وہ ابھی گھر سے باہر گئی ہے۔ میں جوتے اور لباس اتار کر باتھ روم میں چلا گیا۔ غسل کرنے کے دوران مجھے ایک بزنس مین دوست کا خیال آیا۔ وہ بمبئی سے میرے ساتھ آیا تھا اور ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا تھا۔ میرے گھر میں اس کے لئے گنجائش نکلتی تھی۔ مگر میں نے اسے گھر میں اس لئے نہیں بلایا کہ وہ بڑا ہی عیاش تھا کاروبار کے بعد صرف شراب وشباب کی باتیں کرتا تھا۔

میں نے اسے کہا تھا کہ میں دوسرے دن اسے دہلی کی سیر کراؤں گا۔ وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "نہیں پارٹنر! دہلی کیا دیکھنا ہے سارے شہر ایک جیسے ہوتے ہیں۔ البتہ ان شہروں کے اندر کی جوانی جدا جدا رنگا رنگ ہوتی ہے۔ آج رات مجھے کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں شراب ہو، کباب ہو، حسن ہو اور شباب ہو، پھر میری جوانی کا خانہ خراب ہو۔ بولو کیسی شاعری کی ہے؟ لے چلو گے؟"

میں نے اس سے جھوٹ موٹ وعدہ کرلیا تھا کہ آج رات اسے کہیں لے جاؤں گا۔ حقیقتاً میں رانی کو چھوڑ کر گھر سے باہر کبھی نہیں جاتا تھا۔ میں نے سوچا دوسرے دن

ہوٹل پہنچ کر اس سے کہہ دوں گا کہ بیوی نے گھر سے نکلنے نہیں دیا تھا مگر بیوی کہاں تھی میں نے غسل خانے سے نکل کر اچھا سا لباس پہنا۔ اس وقت تک رانی واپس نہیں آئی تھی۔ میں نے ارادہ کیا کہ اس سے ناراض ہونا چاہئے اور ناراضگی ظاہر کرنے کے لئے آج کم از کم آدھی رات تک اپنے اس دوست کے ساتھ رہنا چاہئے۔

میں نے ایک کاغذ پر لکھا۔ "رانی! میری آرزوؤں اور ارمانوں کی رانی! میں تمہارے بغیر بمبئی میں نہ رہ سکا۔ دو دن پہلے ہی بھاگ کر چلا آیا۔ بڑے ارمان لے کر آیا تھا کہ گھر کی ڈیوڑھی پار کرتے ہی تمہیں گلے لگا کر تمہاری ذات میں گم ہو جاؤں گا۔ مگر افسوس' اب یہ گھر تمہارے بغیر کاٹنے کو دوڑ رہا ہے۔ تم واپس آ کر اسے پڑھو گی تو پھر میرے بغیر تمہیں بھی یہ گھر کاٹنے لگے گا۔ تمہاری سزا یہی ہے۔ میں صبح تک واپس آؤں گا۔ تمہارا دیوانہ آنند۔"

یہ لکھ کر میں نے وہ کاغذ میز پر اپنی تصویر کے پاس رکھ دیا۔ باہر آ کر گھر کے دروازے کو لاک کیا۔ پھر اپنے دوست کے پاس ہوٹل پہنچ گیا۔ دہلی میں کتنے ہی بڑے بڑے سیٹھ میرے دوست بن گئے تھے۔ ہوٹل سے میں نے ایک سیٹھ کو فون کیا۔ "سیٹھ جی! بمبئی سے میرا ایک خاص بزنس مین دوست آیا ہے۔ بڑا شوقین مزاج ہے۔ اگر آپ کے کلب میں داخل ہونے کے لئے ہمیں دو اجازت نامے دلوا دیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔"

سیٹھ نے کہا۔ "رات دس بجے کلب کے کاؤنٹر پر جانا۔ وہاں تمہیں دو کارڈ پاس مل جائیں گے۔ اپنے دوست کا نام اور بمبئی کا پتہ بتاؤ۔"

میں نے نام اور پتہ بتا دیا۔ رات کے دس بجے میں اپنے مہمان دوست کے ساتھ کلب کے کاؤنٹر پر پہنچا۔ وہاں ہم دونوں کے نام کا کارڈ بنا ہوا تھا۔ ان کارڈز کے ذریعے ہم کلب کے پرائیویٹ حصوں میں پہنچے وہاں قمار خانہ شراب خانہ اور شباب خانہ سب کچھ تھا۔ بڑی خوبصورت جگہ تھی۔ کلب کے ایک دور افتادہ حصے میں کئی خوبصورت بیڈ روم تھے جن کے دروازے باہر سے لاک رہتے تھے۔ ان کی چابیاں کاؤنٹر کے کی بورڈ پر کمروں کے نمبروں کے ساتھ لٹکی رہتی تھیں۔

پہلے ہم بار میں جا کر بیٹھے۔ ایک گھنٹے تک پیتے رہے۔ میں تاش کھیلنے کے لئے دس ہزار روپے لے کر آیا تھا۔ اس لئے قمار خانہ میں چلا گیا۔ میرے مہمان دوست نے کی



بورڈ سے ایک چابی کا انتخاب کیا۔ اس کی قیمت ادا کی پھر اس نمبر کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

قمار خانہ کی ہر میز پر جوا کھیلنے والوں کی بھیڑ لگی تھی۔ وہاں کی فضا سگریٹ کے دھوئیں سے دھندلائی ہوئی تھی۔ ہر سو شراب کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے قمار خانہ کے بنک کاؤنٹر سے دو ہزار روپے کے ٹوکن لئے پھر ایک میز کے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ وہاں کھیل جاری تھا۔ دوسرا راؤنڈ شروع ہونے پر میں اس کھیل میں شریک ہو سکتا تھا۔ اس لئے میں انتظار کرنے لگا۔

کھیل لمبا ہو گیا تھا میں نے آدھے گھنٹے تک انتظار کیا پھر بیزار ہو کر دوسری میز پر جانا چاہتا تھا کہ دروازے کی طرف دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہاں میرا مہمان دوست کھڑا تھا۔ وہ مقفل کمرے سے گزر کر بڑی جلدی آ گیا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ میں تیزی سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا۔ قریب پہنچ کر دیکھا تو اس کے چہرے پر خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔

میرا سر گھوم گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا میں نے اسے جھنجھوڑ کر پوچھا۔ "کمرے کا نمبر بتاؤ؟"

اس نے نمبر بتایا۔ میں ایک وحشی کی طرح دوڑتا ہوا ادھر گیا۔ کمرے کے سامنے پہنچ کر میں نے دروازے کو ایک لات ماری۔ وہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ سامنے ہی بستر پر وہ اوندھے منہ پڑی رو رہی تھی۔ دروازے پر دھماکہ ہونے سے اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ہماری نظریں ٹکرائیں۔ اچھا ہوا میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ورنہ میں اسی وقت اسے قتل کر دیتا۔ اچھا ہوا بروقت عقل آ گئی۔ دماغ نے سمجھایا کہ گندی نالیوں میں جھک کر اسے سنبھالتا رہوں گا تو خود بھی غلاظت کی طرف جھکتا رہوں گا اسے تو ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہئے۔ اس سے جتنی بھی دوری ہو' اتنا ہی اچھا ہے۔

میں وہاں سے پلٹ کر بھاگتا ہوا چلا گیا۔ کلب سے باہر آ گیا۔ آدھی رات کو ویران سڑکوں پر دوڑتا چلا گیا۔ جیسے میں گناہ گار تھا۔ مجھے شرم آ رہی تھی اور میں منہ چھپانے کے لئے بھاگا جا رہا تھا۔ میں گھر کی طرف نہیں گیا۔ اب وہ میرا گھر نہیں تھا۔ میں بھاگتے بھاگتے غریبوں کی اس بستی میں آ گیا۔ تب سے میں یہیں ہوں۔ یہاں بھوک ہے۔ محتاجی ہے۔ مگر یہ دیکھ کر سکون ملتا ہے کہ غریب عورتیں' ان عورتوں کو رانی

جیسی بڑے گھرانوں کی عورتوں کی طرح نفسیاتی روگ نہیں لگتا۔"

آنند یہاں تک اپنی آپ بیتی سنانے کے بعد چپ ہو گیا۔ سیتا کرسی پر بیٹھی دیکھے جارہی تھی۔ دروازے پر میٹھی دادا کی آواز سنائی دی۔ "دوپہر ہو گئی ہے
کو بھوک لگی ہو گی۔ یہ سوچ کر کچھ کھانے کو لے آیا ہوں۔"

سیتا نے کرسی سے اٹھ کر دیکھا۔ میٹھی دادا کے ساتھ ایک لڑکا ہاتھوں میں
کی بڑی ٹرے اٹھائے کھڑا تھا پھر اس نے آگے بڑھ کر آنند کے سرہانے کی میز پر ٹرے کو رکھ دیا۔ میٹھی دادا نے کہا۔ "سیتا جی! یہ کھانا آپ کے لائق تو نہیں ہے،
بھی ہماری خوشی سمجھ کر کھالیں۔"

"میٹھی دادا یہ کھانا میرے لئے بہت بڑی نعمت ہے۔ ایسا کھانا کم لوگوں کو ن
ہوتا ہے' جو محنت اور خلوص سے پیش کیا گیا ہو۔ آیئے آپ بھی شریک ہو جایئے۔"

"میں پیٹ بھر کر آیا ہوں۔ آپ دونوں کھائیں میں پھر آؤں گا۔"

وہ چلا گیا۔ آنند نے کہا۔ "اتنا زہر اگلنے کے بعد مجھ سے کھایا نہیں جائے گا۔"

وہ بولی۔ "اتنا زہر اگلنے کے بعد پیٹ خالی ہو گیا ہو گا۔ آدمی کو زندہ رہنے اور اگلتے رہنے کے لئے کچھ کھانا پڑتا ہے۔ یہ لو۔"

اس نے کھانے کی پلیٹ بڑھائی۔ آنند نے انکار کیا تو بولی۔ "اگر تم یہ چا
کہ میں تمہارے گھر سے بھوکی نہ جاؤں تو اس پلیٹ کا سارا کھانا کھالو۔"

اسے مجبور ہو کر کھانا پڑا۔ سیتا نے اپنی پلیٹ سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ "را
کوئی خبر ہے؟"

وہ دھیرے دھیرے لقمہ چباتے ہوئے بولا "میں اس کھولی میں تین برس بالکل تنہا اور گمنام رہا۔ ادھر کچہری کے باہر لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوں۔ تین وقت
روٹیوں اور ایک بوتل شراب کے لئے کافی پیسے مل جاتے ہیں۔ تین برس کے بعد
دن پتہ نہیں رانی کہاں سے میرا پیچھا کرتی ہوئی یہاں پہنچ گئی۔ رات کا وقت تھا۔
گئی ہوئی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ گرمی کی وجہ سے میں نے دروازہ کھلا چھو
تھا۔ اندھیرے میں بیٹھ کر پی رہا تھا تبھی وہ دروازے پر نظر آئی۔

اس کی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ مگر میں اس کے سائے کو بھی پہچان لیتا
وہ آہستگی سے بولی۔ "اچھے وقت آئی ہوں اس علاقے سے بجلی گئی ہوئی ہے۔ تم



یا صورت کو نہیں دیکھ سکو گے۔"

میں نے غصہ سے کہا۔ "یہاں کیوں آئی ہو چلی جاؤ۔ نہیں تو یہ بوتل تمہارے سر
توڑ دوں گا۔"

"میں جانے کے لئے آئی ہوں۔ جانتی ہوں کہ تمہارے ساتھ رہنے کے قابل
ں ہوں۔ مگر تمہیں دور ہی دور سے دیکھنے کا حق رکھتی ہوں۔"

"میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ دور سے دیکھنے کا حق بھی ختم ہو جائے گا۔"

"آنند! تم مجھے بڑی سے بڑی سزا دے دینا مگر طلاق نہ دینا۔ میں ایک دن تمہیں
ا عورت بن کر دکھاؤں گی۔"

"یہ میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔"

"پہلے کی بات اور تھی۔ اب میں دماغی مریضوں کے ہسپتال میں جاتی رہتی
وں۔ ایک ڈاکٹر میرا علاج کر رہا ہے۔"

"دنیا کا کوئی ڈاکٹر کسی بدچلن کو نیک نہیں بنا سکتا۔"

"پہلے میں بھی خود کو بدچلن سمجھ کر روتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے میری پتا سننے
کے بعد میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا بیٹی! اگر تم بدچلن ہوتیں تو میں تمہیں بیٹی نہ کہتا۔
قین کرو تم ایک مریضہ ہو۔ میں تمہارا علاج کروں گا۔"

"کیا تم مجھ سے علاج کے پیسے لینے آئی ہو تمہارے ایک لاکھ روپے میری زندگی
کے ساتھ چپکے ہوئے ہیں تم جب چاہو' بیمہ پالیسی کو کیش کرا سکتی ہو۔"

"نہیں آنند! ہماری موت تک وہ پالیسی قائم رہے گی۔ اس پالیسی کے کاغذات
پر ہم نے محبت کے دستخط کئے تھے۔ تم مجھ سے چاہے جتنی نفرت کر لو' اس دستخط کو نہیں
مٹا سکو گے اور نہ ہی مٹانے دوں گی۔ ایک دن ڈاکٹری سرٹیفکیٹ لے کر آؤں گی کہ
میں بالکل نارمل ہو گئی ہوں۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ پیتا رہا۔ وہ تھوڑی دیر تک سر جھکائے
کھڑی رہی۔ پھر پلٹ کر خاموشی سے چلی گئی۔ ہمیشہ کی طرح مجھے بیوقوف بنانے آئی تھی
سمجھ رہی تھی کہ میں پھر اس کا دیوانہ بن جاؤں گا لیکن میں نے اس پر تھوکنا بھی گوارا
نہیں کیا۔"

سیتا نے پوچھا۔ "وہ پھر آئی ہوگی؟"

"ہاں چھ ماہ بعد میں نے ایک صبح گھر سے نکلنے کے لئے دروازہ کھولا تو چوکھٹ پر پھولوں کا ایک بڑا سا گلدستہ رکھا ہوا تھا۔ اس گلدستہ میں ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نظر آیا۔ میں نے پھولوں کو اٹھایا وہ تازہ تھے' خوب خوشبو لٹا رہے تھے۔ میں نے کاغذ کھول کر دیکھا۔ رانی نے لکھا تھا۔ "آج ۴ اپریل ہے آج ہماری شادی ہوئی تھی۔ سالگرہ کے شبھ دن میں تم سے ایک چھوٹی سی التجا کرتی ہوں آج دیوی ماں کے مندر میں جاکر میرے لئے پرارتھنا کرو کہ تمہاری رانی اچھی ہو جائے۔ یا اگر رانی اچھی عورت بن کر زندہ نہ رہ سکے تو ایک اچھی عورت کی موت مرجائے۔ میرے پران ناتھ' میں آپ ہی کے چرنوں میں جان دوں۔ مجھے دیوی ماں سے یہی قبولیت ملے۔ تمہاری بس تمہاری رانی۔"

آنند اتنا کہنے کے بعد سیتا کی کرسی کے پیچھے پیاسی نظروں سے دیکھنے لگا کیونکہ پیچھے شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ وہ بولا۔ "تم نے پابندی لگا کر اچھا نہیں کیا۔ بڑی طلب ہو رہی ہے۔"

سیتا نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے رانی کے خط کو پھاڑ ڈالا ہو گا اور پھولوں کو نوچ کر پھینک دیا ہو گا؟"

"ہاں اب وہ کسی ہتھکنڈے سے مجھے بیوقوف نہیں بنا سکے گی۔"

"جو عورت بھگوان کے چرنوں پر چڑھائے جانے والے پھول تمہاری چوکھٹ پر لاکر چڑھاتی ہو اس کے اندر تو سچائی ہو گی۔"

"کسی کو بار بار سچائی سمجھ کر گلے لگایا جائے اور پتہ چلے کہ ہر بار مکاری گلے لگ رہی ہے تو پھر کسی پر بھروسا نہیں رہ جاتا۔"

"تم بھی ٹھیک ہی کہتے ہو۔ ویسے ایک بات بتاؤ تم رانی کو کبھی کسی ماہرِ نفسیات کے پاس کیوں نہیں لے گئے؟"

"میں کسی ڈاکٹر اور ماہر نفسیات سے کیا کہتا؟ کس منہ سے رانی کی وحشت ناک بے حیائی کی ہسٹری سناتا؟ مجھے شرم آتی تھی۔ خود رانی اپنے نفسیاتی تجزیے سے شرماتی تھی' بڑے عزم سے کہتی تھی کہ اپنے جنون پر قابو پالے گی۔"

"یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا عزم ابھی تک زندہ ہے۔ آنند! ذرا سوچو کہ بری عورت کون ہے؟ وہ ہے جو برائیوں میں ڈوب جاتی ہے اور برائیوں سے لڑتی نہیں



ہے۔ رانی تمام کی تمام بری نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ لڑتی رہتی ہے پہلے تمہارا سہارا ڈھونڈتی تھی۔ اب ڈاکٹر کے سہارے اپنے اندر کے شیطان سے جنگ لڑ رہی ہے۔"

"سونی! تم اس عورت کی حمایت میں بول رہی ہو' جس نے مجھ کو تم سے چھین لیا۔"

"ہماری تمہاری کہانی کوئی فلمی کہانی نہیں ہے' جس میں ایک برا آدمی ہوتا ہے اور کہانی کے آخر میں اسے برائی کی سزا دے دی جاتی ہے۔ ہم تعلیم یافتہ ہیں ہمیں ان تمام برے لوگوں سے دوستی رکھنی چاہئے' جو گرتے ہوں اور سنبھلتے ہوں پھر گرتے ہوں اور پھر سنبھلتے ہوں۔ ہم انہیں حوصلہ دے سکتے ہیں راستہ دکھانے میں شرم کیسی؟ اگر تم پہلے ہی رانی کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے تو صرف ایک ڈاکٹر کے سامنے ذرا سی بے شرمی ہوتی۔ یہ تو رانی کا حوصلہ ہے کہ تمہاری نفرت کے باوجود سنبھلنے کے راستہ پر چلی جا رہی ہے۔"

آنند چپ رہا۔ وہ بولی۔ "رانی مجھ سے بہت پہلے تم سے محبت کرتی تھی۔ اس نے اپنی محبت سے مجبور ہو کر ہمیں جدا کر دیا۔ مگر یہ بات تو پرانی ہو چکی ہے۔ وہ وقت گزر چکا ہے وقت واپس نہیں آئے گا۔ رانی واپس آجائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ آنند نے پوچھا۔ "کیا جا رہی ہو؟" پھر بولا۔ "ہاں صبح سے بیٹھی ہو۔ تمہارے آگے بھی کوئی سوال جواب کرنے والا ہے۔"

"میں پھر آؤں گی۔"

وہ اپنی ساری درست کرتے ہوئے وہاں سے جانے لگی۔ دروازے کے پاس رک کر بولی۔ "ہاں وہ چھایا کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟ اس نے خودکشی کیوں کی تھی؟"

"ہم بھائی بہن جس خاندان میں جاکر پھنس گئے تھے وہاں آدمی پاگل ہو جاتا ہے یا خودکشی کر لیتا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جان سکا۔"

"آنند! تمہارا دکھڑا سننے کے بعد سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں۔ یہاں سے جو کچھ سن کر جا رہی ہوں' وہ ساری باتیں جانے کب تک میرے دماغ میں گونجتی رہیں گی۔"

وہ گھوم کر جانا چاہتی تھی کہ کرسی کے پیچھے شراب کی بوتل نظر آگئی وہ بولی۔

"اس میں تھوڑی سی شراب رہ گئی ہے۔ کیا اسے پیو گے؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "تم سے وعدہ کیا ہے۔ کیسے پی سکتا ہوں؟"

"ہاں میں چاہتی ہوں کہ یہ بوتل ہمیشہ تمہارے سامنے رہے اور مجھ سے کیا ہوا وعدہ یاد آتا رہے۔ میں جاؤں؟ پھر آؤں گی۔"

وہ گھوم کر کمرے سے باہر دروازے کے پار گئی۔ پھر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ آنند تھوڑی دیر تک خالی چوکھٹ کو دیکھتا رہا پھر شراب کی بوتل کو گھورنے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا مگر ایک جنونی کشش تھی' جو نشے کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی۔

جب وہ گھر پہنچی تو شام ہو چکی تھی۔ ڈرائنگ روم سے گزرتے ہوئے اس نے بلراج کو دیکھا۔ وہ اوپری زینے پر کھڑا اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ سیتا زینے پر چڑھتے ہوئے خواب گاہ کی طرف جانے لگی۔ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "خوب دل بہلایا جا رہا ہے۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ چپ چاپ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے جانے لگی۔ بلراج نے اس کے بازو کو سختی سے جکڑ کر اسے روک لیا۔ سیتا نے دیکھا' اس کے بازو پر ریچھ کی طرح لمبے اور گھنے بال تھے وہ شادی کی رات سے ریچھ کے ان بازوؤں کو دیکھ آ رہی تھی لیکن اس وقت دیکھا تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "چھوڑیئے چھوڑ دیجئے۔"

"کیا اس کے پاس گئی تھیں؟"

"ہاں گئی تھی۔"

"وہ تمہارا کیا لگتا ہے؟"

"گالی مت دیجئے۔ وہ میرا وہ نہیں لگتا' جو رانی آپ کی لگتی رہی۔"

وہ پہلے چونکا۔ پھر بولا۔ "اس کی بات مت کرو۔ وہ رنڈی تھی۔"

"جو عورت کو رنڈی بنا دیتے ہیں' انہیں کیا کہنا چاہئے؟"

"بکواس مت کرو۔ میرا حکم ہے کہ تم آنند سے نہیں ملو گی۔"

"میں مالتی' آنند اور رانی ایک کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔ ہماری پرانی جان پہچان ہے۔ کوئی وجہ بتایئے کہ میں آنند سے کیوں نہیں مل سکتی؟"

"مجھے پسند نہیں ہے۔"



"میں مہذب انداز میں ملنے جاتی ہوں' یہ آپ کو پسند نہیں ہے۔ آپ گناہگار بن کر پرائی عورتوں سے ملتے رہتے ہیں' میں اسے کب تک پسند کرتی رہوں؟"

"مجھ سے بحث مت کرو۔"

"آپ نے بحث شروع کی ہے۔ اسے جاری رہنا چاہئے۔ مجھے اس کا فیصلہ کن جواب ملنا چاہئے کہ آپ کی بیوی دوسرے سے کیوں نہیں مل سکتی۔ آپ دوسروں کی بیویوں سے کیوں مل سکتے ہیں؟ یہ کس دھرم کی کتاب میں لکھا ہے؟ کس قانون نے آپ کو اجازت دی ہے؟"

"یہ میرے گھر سے باہر کے معاملات ہیں میرا کاروبار ایسا ہے کہ عورتوں سے تعلقات رکھنے پڑتے ہیں۔"

"میں جانتی ہوں آپ کا کاروبار۔ کوئی بڑا سرکاری ٹھیکہ لینا ہو تو پہلے آپ افسروں کی بیویوں کو ہزاروں لاکھوں کے تحفے دے کر پھانستے ہیں۔ آپ کے افیون کے اڈوں پر پولیس چھاپہ نہ مارے' اس لئے آپ پولیس افسران کو رقم کے ساتھ ساتھ عورت بھی پیش کرتے ہیں۔ آپ کا کوئی کاروبار عورت کے بغیر نہیں چلتا۔ آپ کے پاس یہ حساب تو ہوگا کہ اب تک کتنا منافع حاصل کیا ہے۔ یہ حساب نہیں ہوگا کہ اب تک کتنی عورتوں کو رنڈیاں بنا چکے ہیں۔"

تڑاخ کی آواز کے ساتھ اس کے منہ پر طمانچہ پڑا۔ وہ لڑکھڑا کے پیچھے گئی پہلے تو اس نے حیرانی سے بلراج کو دیکھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بلراج اس پر ہاتھ اٹھائے گا۔ وہ ایک دم سے بپھر گئی۔ "تم نے مجھے مارا؟ کیا میں کوئی جاہل عورت ہوں کہ گالی یا مارپیٹ برداشت کرلوں گی۔ میرے ماحول نے میری تعلیم نے سکھایا ہے کہ اپنی برداشت کی آخری حد تک اپنے پتی کی برائیوں کو نظرانداز کرو۔ اس کا حکم مانتے مانتے اس کا دل جیت لو۔ مگر آج تم نے انتہا کردی۔ اب تم اس وقت تک قریب نہیں آؤ گے' جب تک اپنے اس جاہلانہ طمانچہ پر ندامت کا اظہار نہیں کرو گے۔ اچھی طرح کان کھول کر سن لو' تم مجھ سے معافی مانگو گے۔"

وہ چیختے ہوئے پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ بلراج پریشان ہو کر اسے جاتے ہوئے اور بیڈ روم کا دروازہ بند کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ہٹ دھرمی کرنے والے بدمعاش اپنی غلطیوں کے باوجود اپنی عورتوں سے کبھی معافی نہیں

مانگتے مگر وہ پڑھا لکھا بدمعاش تھا۔ یہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ سنیتا جیسی عورتیں مار
برداشت نہیں کرتیں اور یہ سمجھتا تھا کہ اس نے دولت سے صرف نام کمایا ہے
سنیتا جیسی سگھڑ اور ملنسار بیوی سے سوسائٹی میں عزت ملی ہے۔ اگر وہ سنیتا سے
نہ کرتا۔ دنیاداری کے لئے گھر نہ بساتا تو دھاون کی طرح راستے گھاٹ کا آدمی
اس دنیا میں اپنے شریف اور مہذب ہونے کا ثبوت پیش کرنے کے لئے بیوی بچ
سرٹیفکیٹ لازمی ہوتا ہے۔

وہ سنیتا کو دھکے دے کر گھر سے نکال نہیں سکتا تھا۔ اس کی جگہ کوئی دوسری
نہیں لا سکتا تھا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ سنیتا نے عورت سماج میں
نام پیدا کیا تھا۔ وہ عورت کے حقوق کے لئے اسے عدالت میں گھسیٹ سکتی تھ
بلراج قانون اور عدالت سے ہمیشہ دور رہتا آیا تھا۔ اسے اتنی عقل تھی کہ سنی
کیس میں اگر شوہر کے کردار کی چھان بین شروع ہوتی تو قانون کے محافظ اس
کالے دھندے تک پہنچ جائیں گے۔ دراصل بلراج، سنیتا سے نہیں بلکہ اپنی دا
کے تنکے سے ڈرتا تھا۔

اس نے بیڈ روم کے بند دروازے کو دیکھا۔ سوچا کہ کل کسی وقت سنیتا کو
اور خوشامد سے منالے گا لیکن اسے آنند کے پاس جانے سے کیسے روکے؟ یہ سمجھ
نہیں آ رہا تھا۔ اس نے آنند کی بیوی رانی کو ہوس کا کھلونا بنا کر رکھا تھا۔ اب یہ ڈ
کہ آنند نے انتقام لینے کے لئے سنیتا سے کھیلنا شروع کیا ہے۔ سنیتا بھٹکنے والی عو
نہیں ہے مگر مرد ہزار ہتھکنڈوں سے بہکا دیتا ہے۔ بلراج ہو یا کوئی اور سب یہی چا
ہیں کہ وہ دوسری عورتوں کو منہ لگائیں، پر کوئی ان کی عورت کا منہ بھی نہ دیکھے۔

ایسا سوچتے وقت اسے مالتی یاد آئی کیسی ٹھوس کردار کی عورت تھی۔ دھ
نے پچیس ہزار روپے اس پر نچھاور کئے تھے، مگر وہ نہ پھسلی۔ بلراج پریشان ہو کر ز
نے اترتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آیا۔ ایک دو روز میں مال کی دوسری کھیپ آ
والی تھی۔ دھاون نے صاف کہہ دیا تھا۔ "دیکھو جانی! میرے پاس مال ہے۔ مگر
نہیں ہے۔ سمجھ گئے نا؟ مالتی کو میرے پاس پہنچا دو اور میرا مال اپنے ریٹ پر اٹھا کر
جاؤ۔"

مالتی کے انکار نے دھاون کو ضدی بنا دیا تھا۔ بلراج نے ڈرائنگ روم میں ٹہ



ریسیور اٹھایا۔ نمبر ڈائل کئے پھر رابطہ قائم ہوتے ہی بولا۔ "ہیلو جگو؟"
جگو کی آواز آئی۔ "جی سرکار۔ میں ابھی فون کرنے ہی والا تھا۔ آپ کے لئے
خوشخبری ہے۔ مالتی اسی شہر میں آگئی ہے۔"

بلراج نے جلدی سے اوپری منزل کی طرف دیکھا کہ کہیں سنیتا نہ سن رہی ہو پھر
ریسیور کے ماؤتھ پیس سے منہ لگا کر آہستگی سے پوچھا۔ "کیا بکتے ہو۔ وہ اسی شہر میں آتی
تو پہلے سنیتا سے ملنے آجاتی۔ تم مالتی کو پہچاننے میں غلطی تو نہیں کر رہے ہو؟"

"نہیں سرکار۔ آپ نے بتایا تھا کہ وہ الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر دینا ناتھ کی
پتنی ہے۔ اس لئے مجھے الہ آباد جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ اپنے پروفیسر پتی کے
ساتھ یہاں کسی رشتہ دار کے ہاں ٹھہری ہے۔ میری گھر والی اس کی ٹوہ میں ہے کل صبح
تک معلوم کرے گی کہ وہ کتنے دنوں کے لئے آئی ہے۔"

بلراج نے پوچھا۔ "کہیں وہ کل ہی واپس نہ چلی جائے؟"

"تو پھر حکم دیں۔ ہم آج رات ہی اسے اٹھا کر اڈے پر پہنچا دیں گے۔"

"آں۔ نں۔ نہیں۔ جلدی کرنے سے کوئی غلطی ہو جائے گی۔ پولیس والے پیچھے
پڑ جائیں گے۔ میں ذرا سوچ کر تمہیں دوبارہ فون کروں گا۔ مجھے اس گھر کا پتہ بتاؤ۔
جہاں مالتی آکر ٹھہری ہے۔"

جگو نے پتہ بتایا۔ بلراج ریسیور رکھ کر سوچنے لگا۔ یہ اچھا موقع تھا۔ مال بھی آ رہا
تھا۔ مالتی بھی شہر میں آگئی تھی۔ وہ سیدھی طرح ماننے والی عورت نہیں تھی۔ وہ تجربہ
رکھتا تھا کہ ایسی عورتوں کو ایک بار زبردستی جھکا دو تو پھر وہ بدنامی کے ڈر سے آئندہ سر
نہیں اٹھاتیں۔ اپنی عزت اور شرافت کا بھرم رکھنے کے لئے کٹھ پتلی بن جاتی ہیں۔ ایسے
تجربات رکھنے کے باوجود بلراج یہ سوچ کر ڈرتا تھا کہ بعد میں مالتی عدالت میں نہ پہنچ
جائے۔ ایسی مصیبت سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ مالتی اور دھاون کے بیچ میں نہ
آئے۔ پردے میں رہ کر سارا کام کرتا رہے۔

اس کے لئے وہ جگو سے کام لے رہا تھا۔ اگر سنیتا اس سے تعاون کرتی اور اپنی
سہیلی کو بہلا پھسلا کر لائن پر لے آتی تو جگو کی ضرورت نہ پڑتی جگو جیسے لوگ تو قتل اور
اغوا جیسی واردات کرتے ہیں اور پولیس کو اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں۔ وہ ٹیلی فون کے
پاس سے اٹھ کر فریج کے پاس آیا۔ اسے کھول کر اس نے وہسکی کی بوتل نکال کر ایک

گلاس میں شراب انڈیلی۔ اس کے ساتھ ہی دماغ تیزی سے سوچتا رہا۔ شراب سے اترتی رہی۔ رہ رہ کر سنیتا پر تاؤ آتا رہا۔ اگر وہ ساتھ دیتی تو............ تو یہ ہی فضول تھا۔ سنیتا اس کی برائیوں کو دور سے دیکھتی تھی۔ مگر ساتھ نہیں دیتی تھ اس کی جگہ اگر رانی ہوتی تو............

رانی کا خیال آتے ہی اس نے چٹکی بجا کر سوچا' کمال ہے' پہلے یہ بات دماغ کیوں نہیں آئی کہ رانی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ شاید اس لئے کہ رانی پچھلے تین بر سے گمنامی کی زندگی گزار رہی ہے اب تو اس کے سب ہی عاشق یہ کہتے ہیں کہ بلی نو چوہے کھا کر گنگا نہا رہی ہے۔ جو کچھ بھی ہو۔ سالی کی کتنی ہی کمزوریاں میرے ہاتھ ہیں میں اسے مجبور کر سکتا ہوں۔

بلراج نے خوش ہو کر دوسری بار گلاس کو بھرا۔ پھر اس کے گھونٹ بھرتا ہوا فون کے پاس آیا۔ ایک منٹ کے بعد ہی وہ فون پر جگو سے کہہ رہا تھا ایک پتہ نو کرو۔ جنتا کالونی' گلی نمبر ۱۲' مکان نمبر بیس۔ اس مکان میں رانی نام کی ایک عور رہتی ہے۔ کیا تم کسی بھروسے والی عورت کو رانی کے پاس بھیج سکتے ہو؟"

"جی سرکار! آپ کام بتائیں۔"

بلراج نے کہا۔ "کوئی عورت رانی سے جا کر اتنا کہہ دے کہ جنتا کالونی کے بـ اسٹاپ پر بلراج کی کار کھڑی ہے رانی اس گاڑی میں جا کر بیٹھ جائے۔ انکار کرے گی شریفوں کے اس محلے میں یہ ثابت کر دیا جائے گا کہ وہ ایک بازاری عورت ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ میں ابھی اپنے اڈے سے کسی عورت کو بھیج دیتا ہوں۔"

"اس وقت آٹھ بجے ہیں۔ میں نو بجے سے پہلے اپنی گاڑی لے کر جنتا کالونی ۔ بس اسٹاپ پر پہنچ جاؤں گا۔ تم آدھ گھنٹے کے اندر رانی تک میرا پیغام پہنچا دو۔"

یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ گلاس اٹھا کر پینے لگا۔ بہت پہلے رانی نے اا سے کہا تھا کہ کوئی اس کے مکان کے سامنے گاڑی لے کر نہ آئے' وہ بدنام ہو جا۔ گی۔ اس لئے بلراج رات کو اس کے گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ کسی عورت کے ذر اسے اپنے پاس بلا رہا تھا۔

وہ گلاس خالی کرنے کے بعد سوا آٹھ بجے کوٹھی سے نکلا۔ پھر اپنی کار میں بیٹھ جنتا کالونی کی طرف جانے لگا۔



☆------☆------☆

رانی ایک دم سے بدل گئی تھی۔ اب اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ دو تین برس پہلے والی عیاش رئیس زادی ہے۔ اس وقت وہ پوجا کے کمرے میں تھی۔ رات کو سونے سے پہلے وہ بھگوان کے چرنوں میں جھک کر اپنی شرم اور سہاگ کی سلامتی کے لئے پرارتھنا کرتی تھی۔ اس کا علاج کرنے والے ڈاکٹر نے تاکید کی تھی کہ وہ رات کو جلدی سوئے اور صبح چار پانچ بجے بیدار ہوا کرے۔ اسی لئے وہ سونے سے پہلے اس وقت اپنے بھگوان کے سامنے آتی تھی۔

اب وہ چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی نہیں کرتی تھی............ سادی سی ساریاں پہنا کرتی تھی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق وہ منہ اندھیرے اٹھ کر یوگا کی مشقیں کرتی تھی۔ پیٹ بھر کر نہیں کھاتی تھی۔ اگر کم کھایا جائے اور یوگا کے ذریعے سانسوں کو قابو میں رکھا جائے تو نفس قابو میں رہتا ہے۔ نفسانی خواہشات اپنی منہ زوری بھول جاتی ہیں اور رانی کے ساتھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ اب وہ دماغی مریضہ نہیں رہی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ وہ کچھ روز اور اسے زیر علاج رکھنے کے بعد مکمل طور پر نارمل ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دے گا۔ بلکہ اس کے ساتھ آنند کے پاس جا کر اپنی زبان سے گواہی دے گا کہ اب وہ رانی کو ایک گالی نہ سمجھے۔ اگر وہ گالی ہوتی تو ایک معروف اور معزز ڈاکٹر اسے بیٹی نہ بناتا۔

ڈاکٹر کی یہ باتیں سن کر وہ بہت خوش تھی۔ وہ خوشی کی مستحق تھی کیونکہ اس نے عام عورتوں کی طرح ہمت نہیں ہاری تھی۔ سنبھلنے کا راستہ ڈھونڈ نکالا تھا اور اس راستے پر کامیابی سے گامزن تھی۔ آج شام سے پہلے وہ آنند کو یہ خوش خبری سنانے اس کی کھولی کی طرف گئی تھی اور وہاں ایک بڑی سی قیمتی کار دیکھ کر سوچ میں پڑ گئی تھی۔ یہ وہی وقت تھا' جب سنیتا آنند کے پاس بیٹھی اس کی رام کہانی کا آخری حصہ سن رہی تھی۔

رانی کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ کمرے کے اندر دونوں کی گفتگو سے پتہ چل گیا تھا کہ آنند کے پاس سنیتا بیٹھی ہوئی ہے۔ تب رانی کو وہ دن یاد آئے' جب اس نے دو محبت کرنے والوں کو جدا کر دیا تھا اور اس کے آنند کو اپنا بنالیا تھا۔ اتنے برسوں کے بعد دو پریمی پھر مل بیٹھے تھے۔ آنند جس انداز میں اپنی آپ بیتی سنا

رہا تھا اس سے رانی کی بے شرمی زیادہ واضح ہو رہی تھی۔ یہ درست ہے کہ وہ شرم تھی لیکن یہ بھی تو درست تھا کہ وہ پوری سچائی سے سیدھے راستے پر چل ہے۔

لیکن آنند یوں بولتا جا رہا تھا کہ سنیتا کو اس سے ہمدردی ہو جائے۔ پرانی محبت سے جوان ہو جائے۔ اس کی داستان کا لبِ لباب یہی تھا کہ وہ اب رانی کو اپنی دھ پتنی کی حیثیت سے قبول نہیں کرے گا۔ یہ دل توڑنے والی بات تھی۔ رانی نے اپنے پر ہاتھ رکھ کر سوچا۔ دنیا کہتی ہے کہ دامن پر لگا ہوا دھبہ دھویا نہیں جا سکتا۔ م دھو رہی ہوں مگر آنند اور سنیتا اسے تسلیم نہیں کریں گے۔ اب سنیتا کو مجھ سے انتقا لینے کا اچھا موقع مل گیا ہے۔ میں نے کالج کی دیواروں پر لکھوایا تھا کہ سنیتا آؤٹ را اِن۔ اب یہ مجھے آؤٹ کرے گی۔

رانی کو بازی ہارنے کے آثار دکھائی دیئے وہ مایوس ہو کر واپس جانا چاہتی تھی۔ تب ہی سنیتا کی آواز سن کر رک گئی۔ سنیتا آنند سے کہہ رہی تھی۔ "یہ ماننا پڑے گا کہ رانی کا عزم ابھی تک زندہ ہے۔ آنند ذرا سوچو کہ بری عورت کون ہے؟ وہ ہے جو برائیوں میں ڈوب جاتی ہے اور برائیوں سے لڑتی نہیں ہے۔ رانی تمام کی تمام بری نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ لڑتی رہتی ہے۔ پہلے تمہارا سہارا ڈھونڈتی تھی اب ڈاکٹر کے سہارے اپنے اندر کے شیطان سے جنگ کر رہی ہے۔"

رانی بڑی حیرانی سے یہ باتیں سن رہی تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جس سے دشمنی کر چکی ہے وہی سنیتا اس کی حمایت میں بولے گی۔ وہ ایسے دلائل کے ساتھ حمایت کر رہی تھی کہ رانی شرم سے زمین میں گڑ گئی۔ اس وقت وہ سنیتا کے سامنے جا کر ہاتھ جوڑ کر اس کے آگے جھکنا چاہتی تھی۔ مگر اسے شرم آ رہی تھی کہ اس کے سامنے جانے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے دماغ نے سمجھایا کہ سامنے جانے کی ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ اب تو سنیتا آنند سے ملنے آتی رہے گی۔ اب وہ ڈاکٹر کے ساتھ ہی یہاں آ کر آنند اور سنیتا کا سامنا کرے گی۔

یہ سوچ کر وہ وہاں سے چپ چاپ واپس آ گئی۔ راستے میں اس کے اندر کچھ ہوتا رہا ضمیر کچھ اور بیدار ہو کر پوچھ رہا تھا کہ وہ سنیتا کے لئے کیا کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا۔ "بیٹی! میں تمہارے ہسٹریائی جذبوں کو سرد کرنے کے لئے دوائیں ضرور دے



رہا ہوں مگر تمہارا کامیاب علاج روحانی طرزِ عمل سے ہو گا۔ طرزِ عمل یہ کہ سادہ سی زندگی گزارو جسم سے زیادہ روح کو خوراک پہنچاؤ۔ اگر کسی کا دل دکھایا ہے تو اب اس کے درد کی دوا کرو۔ کسی کا گھر جلایا ہے تو سوچو کہ اس کے لئے ایک نیا آشیانہ کیسے بنا سکتی ہو؟"

ڈاکٹر کی یہ باتیں اب رانی کے دل کو لگ رہی تھیں۔ اس نے آنند اور سنیتا کے سپنوں کے محل میں آگ لگائی تھی۔ آنند کو اس سے چھین کر بلراج کو سنیتا کے گھر کا راستہ بتا دیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ بلراج برا آدمی ہے' وہ سنیتا کی زندگی کو برباد کر دے گا۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا۔ وقت گزر چکا تھا۔ اب اپنی غلطیوں کی تلافی کا وقت آیا تھا۔ رات کو سونے سے پہلے وہ بھگوان کے سامنے ہاتھ جوڑے کہہ رہی تھی۔ "میں سمجھ رہی تھی کہ میرے اندر کی بیماری ختم ہو چکی ہے۔ مگر سنیتا نے احساس دلایا ہے کہ میں اسے برباد کر کے اوپر سے صحت یاب ہو سکتی ہوں لیکن میری آتما ہمیشہ بیمار رہے گی۔ بھگوان مجھے کوئی راستہ دکھا دے کہ میں سنیتا کے کسی کام آ سکوں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی بیرونی دروازے پر دستک سنائی دی اس نے دوسرے کمرے سے گزر کر باہر والا دروازہ کھول دیا۔ باہر ایک اجنبی عورت کھڑی ہوئی سگریٹ پی رہی تھی۔ دھوئیں سے پتہ چل گیا کہ سگریٹ میں چرس ہے۔ رانی نے گھور کر پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

وہ آنکھ مار کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "ادھر کالونی کے بس اسٹاپ پر تمہارا یار گاڑی لے کر آیا ہے۔ بولتا ہے چپ سے آ کر گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ نہیں تو محلے پڑوس والوں کو تمہارا اصلی روپ دکھا دیا جائے گا۔"

رانی کو غصہ آنا چاہئے تھا مگر یوگا کی مشقوں سے یہی فائدہ پہنچا ہے کہ غصہ کے وقت بھی آدمی پُرسکون رہنا سیکھ لیتا ہے۔ اس نے بڑے سکون سے پوچھا۔ "گاڑی لے کر کون آیا ہے؟"

"اپنا بلراج سیٹھ ہے۔"

بلراج کا نام سنتے ہی سنیتا نگاہوں کے سامنے آ گئی اس نے آنے والی سے کہا۔ "تم جاؤ میں ابھی آتی ہوں۔"

یہ کہتے ہی اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ اپنے ایک سوٹ کیس کے پاس

آکر اسے کھولا۔ کپڑوں کی تہہ میں ایک چھوٹا سا پستول رکھا ہوا تھا۔ وہ اسے نکال
لوڈ کرنے لگی۔ ڈاکٹر نے ایک بار سمجھایا تھا کہ برائیوں سے لڑنے کے لئے بڑے ہتھیا
استعمال کرنا ضروری نہیں ہے مگر وہ رانی تھی۔ وہ گھناؤنی برائیوں کے اندر گھس ک
سمجھ چکی تھی کہ خدا کے احکامات' پیغمبروں کی ہدایات اور اخلاقیات کا درس دینے ک
بعد بھی برائی سامنے آئے تو لوہے کو لوہے سے اور برائی کو برائی سے کاٹنا پڑتا ہے۔

اس نے پستول کو اپنے پرس میں رکھا۔ پھر کچھ سوچ کر پستول کو وہاں سے نکالا او
ساری کے اندر چھپالیا۔ دونوں کمروں کی بتیاں بجھادیں۔ باہر آکر دروازے پر تا
لگایا۔ پھر بس اسٹاپ تک پہنچ گئی۔ بلراج اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اسے دیکھتے ہی اگ
دروازہ کھول دیا۔ وہ دروازے پر جھک کر بولی۔ "کیا تم میرے محلے والوں کو میرا
اصلی روپ دکھاؤ گے؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "ارے نہیں میں نے تمہیں غصہ دلانے کے لئے یہ بات
کہلائی تھی' میں جانتا ہوں ناکہ تم غصہ میں دوڑتی چلی آتی ہو ویسے تعجب ہے تم بڑی
پُرسکون نظر آرہی ہو۔"

وہ بیٹھ کر دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ "غصہ انہیں آتا ہے جو نارمل نہیں
ہوتے یا اپنی شکتی کو نہیں پہچانتے۔ میں آگے نہیں جاؤں گی' جو کہنا ہے یہیں کہو اور
چلے جاؤ۔"

وہ بڑی حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم نے میک اپ نہیں کیا ہے' بھڑکیلا
لباس نہیں پہنا ہے' کیا جوگن بن گئی ہو؟"

"کام کی بات کرو کیوں آئے ہو؟"

"یہ یاد دلانے کے لئے کہ کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی۔"

"میں تمہیں پہلے بھی سمجھا چکی ہوں کہ وہ رانی مرچکی ہے۔ میں صرف اپنے آنند
کے لئے زندہ ہوں' اب کبھی میری آرزو نہ کرو۔"

"نہیں کروں گا۔ میں دوسری ضرورت سے آیا ہوں میرا ایک کام ہے' وہ تم ہی
کرسکتی ہو۔"

"کیا کام ہے؟"

"دھاون کو تم جانتی ہو' سالے کو جو پسند آتی ہے اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے آج



کل مالتی کا دیوانہ بنا ہوا ہے۔"

"کون مالتی؟"

"وہی سیتا کی سہیلی تمہارے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔"

رانی کو یاد آگیا۔ اس نے ہونٹوں کو بھینچ کر اسے دیکھا پھر بولی۔ "وہ نہایت
سنجیدہ اور شریف لڑکی تھی۔ میں یقین سے کہتی ہوں کہ وہ اب بھی شرافت کی زندگی
گزار رہی ہوگی۔"

"ہاں یہی تو مصیبت ہے۔ دھاون نے اسے پچیس ہزار کا لالچ دیا وہ تھوک کر چلی
گئی۔ وہ مالتی کا بڑے سے بڑا مطالبہ پورا کرنے کو تیار ہے اگر وہ داشتہ بننے کو راضی
ہوجائے تو اسے ایک کوٹھی اور کار خرید کردے سکتا ہے۔ ماہانہ اخراجات کے لئے پانچ
ہزار روپے دیتا رہے گا۔"

"یعنی شیطان پیچھا نہیں چھوڑے گا۔"

بلراج نے سرہلا کر کہا۔ "ہاں اس کے غنڈے مالتی کو اٹھا کر لے جاسکتے ہیں مگر میں
سیدھا سارا راستہ ڈھونڈ کر تمہارے پاس آیا ہوں۔"

"میں کیا کرسکتی ہوں؟"

"دیکھو مالتی کا پتی ہزار دو ہزار کمانے والا پروفیسر ہے۔ اتنی حسین عورت ایک
پروفیسر کے پاس ضائع ہورہی ہے۔ تمہاری اس سے پرانی جان پہچان ہے تم اسے مایا
جال میں پھانس کر لاسکتی ہو' اس کی کوئی کمزوری معلوم کرسکتی ہو اسے کسی طرح
ضرورت مند بنا کر اسے بڑی سے بڑی رقم دے کر اپنا احسان مند بنا کر ہماری لائن پر
لاسکتی ہو۔"

رانی نے پوچھا۔ "سیتا مجھ سے زیادہ مالتی کے قریب ہے کیا تم اس سے کام نہیں
لے سکتے؟"

"وہ ایسے کاموں میں میرا ساتھ نہیں دیتی ہے۔ مالتی کے سلسلہ میں وہ کوئی غلط
بات سن نہیں سکتی۔"

رانی کے جی میں آیا کہ وہ بھی صاف صاف انکار کردے۔ پھر یاد آیا کہ بلراج
اور دھاون کیسے لوگ ہیں۔ جب مالتی سہولت سے حاصل نہیں ہوگی تو اسے اٹھوالیا
جائے گا لہٰذا ابھی انکار کرکے مالتی کے لئے خطرہ پیدا نہیں کرنا چاہئے' اس نے پوچھا۔

"مالتی کہاں رہتی ہے؟"

"یوں تو الہ آباد میں رہتی ہے مگر آج کل اسی شہر میں ہے میں ابھی اس کے مکان تک تمہیں پہنچا سکتا ہوں۔"

"اتنی جلدی بھی کیا ہے مجھے سوچنے دو۔"

"بعد میں سوچ لینا۔ ابھی جاکر کسی بہانے اس سے ملو' ایسا نہ ہو کہ کل تک وہ یہاں سے چلی جائے۔ پہلے پتہ کرلو کہ وہ اپنے پتی کے ساتھ کیوں آئی ہے اور یہاں کب تک رہے گی۔ اگر وہ جلدی جانا چاہے تو سوچو کہ اسے کس طرح روک سکتی ہو۔ اگر روکنے میں ناکام ہو جاؤ گی تو پھر غنڈوں سے کام لیا جائے گا۔"

"اف! ایک عورت کے لئے' محض اپنی ضد پوری کرنے کے لئے تم لوگ کیسے کیسے کھیل کھیلتے ہو۔ بلراج! وہ پروفیسر غریب سہی مگر مالتی عزت آبرو سے زندگی گزار رہی ہے اسے برباد کر کے تمہیں کیا ملے گا؟"

"میرے اور دھاون کے بیچ کاروباری لین دین ہے۔ میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا بولو چلتی ہو مالتی کے گھر تک؟"

وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔ "جب تمہارا کام مجھ سے ہی ہو سکتا ہے تو چلو۔"

گاڑی آگے بڑھ گئی' اس نے پوچھا۔ "سنیتا کیسی ہے؟"

وہ بولا۔ "تمہارے بھڑکانے سے میں نے اس سے شادی کی' سوچا تھا جیسے دوسری عورت کو نچاتا ہوں ویسے ہی اسے بھی کٹھ پتلی بناؤں گا مگر وہ عجیب عورت ہے وفادار ہے مگر میری بے وفائی کا گلہ نہیں کرتی خود سچی ہے مگر میرا ہر جھوٹ برداشت کر لیتی ہے۔ بس ایک برائی ہے جب اپنے حقوق کی بات آتی ہے تو ضدی اور سرکش بن جاتی ہے۔"

"تعجب ہے تمہارے جیسا آدمی ایک ضدی اور سرکش عورت کو برداشت کر رہا ہے۔"

"مجبوری ہے' ایک تو یہ کہ وہ مجھے پسند ہے' دوسرے یہ کہ وہ میرے بہت سے اڈوں اور کالے دھندوں کو جانتی ہے۔ میں اسے قتل کر سکتا ہوں مگر چھوڑ نہیں سکتا۔ کل سے وہ پھر میرے لئے پریشانی کا سبب بن رہی ہے۔"



"کیا ہوا؟"

"کل سے وہ آنند کے پاس جانے لگی ہے وہ میرے اور تمہارے تعلقات کو جانتا ہے اب وہ مجھ سے انتقام لینے کے لئے سنیتا کو............"

رانی نے فوراً ہی بات کاٹ کر کہا۔ "بس آگے نہ بولنا۔ جب ہم گناہگار آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو سب ہی گناہگار نظر آتے ہیں۔ یہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا میں ابھی شرافت اور کردار کی سچائی باقی ہے آنند اور سنیتا کی ملاقات کو گالی نہ دو۔"

"کیا بات ہے' پہلے تو تم سنیتا کی دشمن تھیں؟"

"پہلے میں خود اپنی دشمن تھی۔ اب اپنی آتما سے دوستی کی ہے تو ساری دنیا دوست نظر آتی ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "مالتی سے بھی دوستی کرنا مگر اپنے لئے نہیں ہمارے لئے' میں تمہیں منہ مانگا معاوضہ دوں گا۔"

گاڑی ایک پارکنگ شیڈ میں رک گئی' وہ باہر آئے۔ گاڑی لاک کی پھر وہ رانی کے ساتھ ایک طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "تھوڑی دور پیدل چلنا ہوگا۔ وہ سامنے والی گلی کے دونوں طرف جو مکانات ہیں ان کے نمبر تم بھی پڑھتی چلو۔ مالتی تین بٹا سترہ مکان میں ملے گی۔"

"کیا وہ کسی رشتے دار کے ہاں آئی ہے؟"

"ہاں میری معلومات یہی ہیں۔"

وہ دونوں جلد ہی مکان نمبر تین بٹا سترہ کے سامنے پہنچ گئے۔ بلراج نے کہا۔ "میں جارہا ہوں' وہیں پارکنگ شیڈ کے پاس رہوں گا۔ کام بنانے کے لئے جتنی بھی دیر ہو پروانہ کرنا۔ میں صبح تک وہاں تمہارا انتظار کروں گا۔"

وہ واپس چلا گیا۔ رانی نفرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دماغ میں بہت دیر سے یہ بات پک رہی تھی۔ مالتی کو کس طرح حفاظت سے الہ آباد روانہ کیا جاسکتا ہے! کیا مالتی کو بتایا جائے کہ شیطان اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟ نہیں! وہ میاں بیوی محبت اور معصومیت میں رہنے والے لوگ ہیں انہیں شیطانی ارادوں کا علم ہوگا تو وہ معصوم بچوں کی طرح ڈر جائیں گے۔ ان کے چھوٹے سے گھر کا سکون برباد ہو جائے گا۔ وہ سپنوں میں بھی شیطانوں کو دیکھ کر سونا بھول جائیں گے۔

نہیں، مجھے کچھ ایسا کرنا چاہئے کہ وہ میاں بیوی دشمنوں سے بے خبر خوش رہیں اور ہر ان پر دشمنوں کا سایہ بھی نہ پڑنے دوں۔"

یہ سوچ کر وہ اس مکان کے احاطہ میں داخل ہوئی۔ بہت عرصہ بعد مالتی کی خبر لی تھی۔ وہ اسے دیکھنا اور اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ کچھ وقت گزار کر اس کی سلامتی کا منصوبہ بنانا چاہتی تھی۔ یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ مالتی حالات سے بے خبر رہ کر اس سے کس حد تک تعاون کرتی ہے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے کے پاس پہنچ گئی۔ مکان کے باہر اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور اس مکان کی کھڑکی سے روشنی باہر آ رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی سسکیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ کسی کے رونے اور کسی کے تسلیاں دینے کی آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ رانی ادھر جانے لگی۔ آنسو بھری آوازیں قریب آنے لگیں۔ کھڑکی پر لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ سلاخوں کے پار کمرے کا اندرونی منظر بڑا ہی ماتمی تھا۔ ایک عورت بال کھولے سر جھکائے فرش پر بیٹھی رو رہی تھی ایک شخص پاس ہی بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ دوسرے رشتے دار اس عورت کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک بوڑھی عورت اس رونے والی کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی جب اس نے روتے روتے سر اٹھایا تو رانی کا دل دھک سے رہ گیا۔ اتنے برسوں کے بعد بھی اس نے مالتی کو پہچان لیا۔ وہ آج بھی ایک دوشیزہ کی طرح حسین اور پُرشباب اور پُرکشش تھی۔ آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ گلاب کی کھلتی ہوئی کلی کی طرح تر و تازہ تھا۔

اور وہ گلاب کی کلی رو رہی تھی۔ کیوں رو رہی تھی رانی کو رفتہ رفتہ اس سوال کا جواب ملنے لگا۔ بستر پر لیٹا ہوا شخص مالتی کا پتی پروفیسر دینا ناتھ تھا۔ بیمار تھا اور کبھی کبھی مالتی کو سمجھا رہا تھا۔ "کیوں وقت سے پہلے روتی ہو، ابھی تو میں زندہ ہوں تمہیں ہنستے بولتے ہوئے مجھے حوصلہ دینا چاہئے۔"

مالتی نے روتے ہوئے پوچھا۔ "میں کس منہ سے ہنسوں، اور کیسے اپنے آپ کو تسلیاں دوں کہ میرا سہاگ سلامت رہے گا۔"

ایک نوجوان نے اس سے کہا۔ "دیدی! ہم سب جیجا جی کے علاج کے لئے کوششیں کر رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب کی زندگی بچانے کے لئے وزیر تعلیم کے پاس



ہی درخواست بھیج دی ہے۔"

مالتی نے کہا۔ "میں سب جانتی ہوں، انہوں نے پچھلے سال سے تبادلے اور تنخواہ میں اضافے کی درخواست دی ہوئی ہے، اس کا جواب آج تک نہیں ملا۔ پھر یہ سرکار ایک معمولی پروفیسر کے علاج کے لئے انہیں امریکہ کیسے بھیجے گی؟ لاکھوں روپے کیوں خرچ کرے گی؟"

ایک بوڑھی عورت نے کہا۔ "بیٹی! دینا ناتھ کے لئے ہم ساری عورتیں اپنا زیور بیچ دیں گی۔"

ایک شخص نے کہا۔ "اس خاندان کے تمام لوگ اپنی ایک ایک ماہ کی تنخواہ علاج کے لئے دیں گے۔"

نوجوان نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "میں اپنے بدن کا سارا خون نکال کر جیجا جی کو دوں گا۔ ان کے بدن سے تمام زہریلا خون نکال دیا جائے گا انہیں بلڈ کینسر سے نجات مل جائے گی۔"

بلڈ کینسر؟ رانی کے دماغ کو شدید جھٹکا لگا۔ پروفیسر دینا ناتھ بلڈ کینسر میں مبتلا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی کمرے کے اندر مالتی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں، کیا مالتی بھری جوانی میں بیوہ ہو جائے گی؟ ہونا تو پڑے گا۔ بلڈ کینسر ایسا مرض ہے کہ دولت مند مریض ہی بے دریغ دولت خرچ کر کے چند برس تک زندہ رہ پاتے ہیں۔ غریبوں کو ہر حال میں مرنا پڑتا ہے۔

یہ بات مالتی سمجھ رہی تھی۔ غریب عورتیں آخر کتنے زیور فروخت کریں گی۔ مردوں کی ایک ایک ماہ کی تنخواہ کیا بنے گی۔ کتنے جوان بھائی اس کے سہاگ کو اپنا خون پلاتے رہیں گے؟ امریکہ جا کر سارا کا سارا خون تبدیل کرنے کے لئے لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے کی ضرورت پڑتی ہے اور اس خاندان کے کسی فرد نے آج تک خواب میں بھی لاکھ روپے نہیں دیکھے تھے۔

رانی نے کھڑکی سے پلٹ کر کچھ سوچا۔ پھر دروازے کے پاس آ کر دستک دینے لگی۔ دستک کی آواز پر کھڑکی سے آنے والی صدائیں رک گئیں۔ ذرا دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ سامنے وہی نوجوان کھڑا ہوا تھا جو پروفیسر کو اپنا سارا خون دے کر بہن کے سہاگ کو سلامت رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک اجنبی عورت کو اپنے گھر کے دروازے

پر دیکھ کر پوچھا۔ "آپ کس سے ملنا چاہتی ہیں؟"

رانی نے کہا۔ "تمہاری دیدی سے۔"

"نام بتائیں۔ دیدی سے کیا کہوں؟"

"کہنا کہ ایک امرت منتھن وہ تھا جب شیو شنکر نے سمندر کا سارا زہر پی لیا آج میں مالتی کے سہاگ کا تمام زہر پینے آئی ہوں۔"

نوجوان نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "میں سمجھا آپ کون ہیں؟"

"مجھے بھگوان نے بھیجا ہے۔ مالتی کی مدد کے لئے۔"

وہ اپنا سر کھجاتے ہوئے بڑبڑایا۔ "میری دیدی کے سہاگ کا زہر پینے میری د کی مدد کے لئے یعنی کہ بھگوان نے بھیجا ہے۔" یہ کہتے ہی وہ اچھل کر پلٹ گیا۔ ؛ سے دوڑتے ہوئے اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے کی طرف چلا گیا۔ رانی ہونٹوں پر پھر ایک سنجیدہ سی مسکراہٹ آگئی۔

ذرا سی دیر میں کتنے ہی قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ کتنے ہی مرد عورتیں ؛ سے چلتے ہوئے۔ لڑکھڑاتے ہوئے، سنبھلتے ہوئے یہ دیکھنے آئے کہ بھگوان نے دیوی کو ان کے دروازے پر بھیجا ہے۔ رانی سفید ساری پہنے ہوئے تھی۔ سیاہ ر زلفیں کھلی ہوئی تھیں، وہ سچ مچ کوئی دیوی لگ رہی تھی۔ بوڑھی عورتوں اور مر نے جلدی سے اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر اپنے سر جھکا لئے۔

"رانی........." مالتی کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔ وہ سب سے پیچھے ک ہوئی تھی۔ رشتے داروں نے دو طرف تقسیم ہو کر اسے درمیان سے گزرنے کا ر دیا۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "یہ تم ہو رانی؟"

رانی نے آگے بڑھ کر اس کے بازوؤں کو تھام کر کہا۔ "ہاں میں ہوں۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا ہے، برا نہ ماننا۔ تم تو بڑی مغرور تھیں۔ مجھ غریب کے کا راستہ کس نے بتا دیا؟"

"بھگوان نے۔" رانی نے اسے گلے لگا کر کہا۔ "ہم اس اوپر والے کی قدر ؛ سمجھ نہیں سکتے۔ اس نے دشمنوں کے ذریعے مجھے یہاں بھیجا میں جو تمہاری اور سن دشمن تھی دوست بن کر آگئی۔ بھگوان ہم سب کی کہانیوں کو ایک پل میں ایسے ؛



دینے والے موڑ پر پہنچا دیتا ہے کہ ہم اس پر حیران ہوتے ہیں مگر اسے سمجھ نہیں پاتے۔"

مالتی اپنے صدمات سے نڈھال تھی، بولی........... "ابھی میں کچھ نہیں سمجھ سکوں گی کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ مگر جانے کیوں اندر سے یوں لگ رہا ہے جیسے میرے پتی کو اب کچھ نہیں ہوگا۔"

"کچھ نہیں ہوگا مالتی! اب رونا بھول جاؤ۔ آج تک کوئی انسان رو رو کر اپنی بدنصیبی کو دور نہیں کر سکا۔"

مالتی نے کہا۔ "ہم اس بات پر روتے ہیں کہ رو کر بھی کچھ نہیں کر سکتے۔"

"ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں میں تم سے ذرا تنہائی میں باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

اس کی بات سن کر تمام رشتے دار وہاں سے جانے لگے۔ رانی نے پہلے باہر والے دروازے کو بند کیا۔ سب لوگ چلے گئے۔ کمرہ خالی ہو گیا تو اس نے اندرونی دروازے کو بھی بند کر دیا۔ پھر قریب آکر مالتی کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "آؤ یہاں بیٹھ جاؤ۔"

مالتی نے ذرا شرمندگی سے کہا۔ "تم میرے گھر آکے مجھے بیٹھنے کے لئے کہہ رہی ہو حالانکہ یہ مجھے کہنا چاہئے۔"

"تمہارا دل اور دماغ تمہارے بس میں نہیں ہے۔"

وہ دونوں ایک جگہ بیٹھ گئیں، مالتی نے پوچھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں دہلی میں ہوں اور یہاں رہتی ہوں۔"

"تمہارے اس سوال کا جواب بہت لمبا ہوگا۔ بہت سا وقت ضائع ہوگا۔ یہ بتانے کے لئے کہ میں یہاں کیسے آئی، مجھے یہ بتانا ہوگا کہ میں بلندی سے پستی میں کیسے گری میں نہ تو دولت مند باپ کی بیٹی رہی اور نہ آنند جیسے جیون ساتھی سے وفا کر سکی۔ مالتی! ابھی تم ڈوب رہی ہو۔ اس لئے میرے اور سیتا کے ڈوبنے کا منظر نہ تو دیکھ سکتی ہو اور نہ ہمارے متعلق کچھ سن سکتی ہو کیونکہ تم خود ڈوبنے سے بچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہو۔ بہتر ہے کہ ابھی صرف پروفیسر صاحب کے علاج کے متعلق باتیں ہوں۔"

مالتی نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "جس طرح بدنصیبی کا علاج نہیں ہوتا اسی طرح میرے پتی لاعلاج ہیں۔"

"دولت ہو تو ناممکن بات ممکن ہو جاتی ہے۔"

"ہاں مجھے اس بات پر بھی رونا آرہا ہے کہ میرے پاس دولت نہیں۔"

"سینتا تم پر جان دیتی ہے' وہ تمہارے سہاگ کی سلامتی کے لئے دو چار روپے چٹکی بجا کر دے سکتی ہے۔"

مالتی نے سر جھکا کر کہا۔ "میں سینتا سے ایک پیسہ بھی لینا نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟ اس سے جھگڑا ہو گیا ہے کیا؟"

"نہیں۔ وہ اتنی مہان اور ملنسار ہے کہ میں کبھی اس سے ناراض ہو سکتی۔"

"پھر اس سے قرض کیوں نہیں لینا چاہتیں؟"

"اس لئے کہ وہ مجھ سے زیادہ غریب ہے۔ اس کے پاس شاندار کوٹھی ہے' قید خانہ ہے ایئرکنڈیشنڈ کار ہے جسے اس نے عورت کا غرور بیچ کر حاصل کیا ہے ا[ور] اکاؤنٹ میں لاکھوں روپے ہیں مگر وہ دولت اسمگلنگ' منشیات فروشی اور عورتوں کی جسم فروشی سے حاصل ہوئی ہے۔ سینتا اس دولت سے جی رہی ہے مگر عورت کے اندر ایک عورت ہے جو ہر لمحہ مرتی رہتی ہے' اسے بلراج سے' اس ماحول سے اور اس کی حرام کی کمائی سے نفرت ہے مگر اس سے کیا ہوتا ہے ہمیں اپنے حالات سے اکثر نفرت ہوتی ہے۔ پھر بھی ہم زندہ رہتے ہیں۔ اچھے دنوں کی میں برے دنوں سے اور برے لوگوں سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔"

رانی نے پوچھا۔ "تم اپنے پتی کے علاج کے لئے برے لوگوں سے سمجھوتہ نہیں کرتیں؟ بلا سے بلراج کی کمائی ناجائز ہو مگر تم سینتا سے کچھ رقم لے کر اپنے وقت کو ٹال سکتی ہو۔"

"رانی! ہم عورتیں جس ماحول سے باندھ دی جاتی ہیں' اسی کے مطابق جینا لیتی ہیں۔ بلراج کا ماحول اور ہے اور میرے پروفیسر کے ماحول نے مجھے سکھایا کھوٹے سکے سے کبھی ایک وقت کی روٹی نہ خریدو۔ میں اپنے پتی کے آدرش پر ہوں پھر ناجائز دولت سے اپنے پتی کی زندگی کیسے خرید سکتی ہوں؟"

"آدرش اور تعمیری اصول یقیناً انسان کو فرشتہ بنا دیتے ہیں مگر جان بوجھ کر پتی کے جیون کو اصولوں کی بھینٹ چڑھا دینا دانشمندی نہیں ہے۔"

مالتی نے زہریلے انداز میں مسکرا کر کہا۔ "ہم لوگ دانشمندی کسے کہتے ہیں



میں ایک طبقہ ہے جو عیش و عشرت سے زندگی گزارنے کے لئے یا کبھی زندگی کو کسی خطرے سے نکال لانے کے لئے وقتی طور پر اخلاق اور تہذیب کو بالائے طاق رکھنا دانشمندی سمجھتا ہے اور ایک طبقہ ہمارا ہے کہ ہم اخلاق اور تہذیب کے لئے مرجانے کو دانشمندی سمجھتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دونوں طبقوں کے لوگ ایک دوسرے کو احمق کہتے ہیں' مجھ سے پوچھا جائے تو مجھے یہ حماقت پسند ہے۔ اس لئے کہ یہ میرے پتی کی پسند ہے۔"

رانی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "سمجھ گئی۔ پروفیسر جی.......... مرجانا پسند کریں گے۔ تم بیوہ بن جانا قبول کرو گی مگر اصولوں کے خلاف کوئی بات قبول نہ ہو گی۔"

مالتی کی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ جبراً مسکراتے ہوئے فخر سے بولی۔ "ہاں میرے پروفیسر کہتے ہیں کہ صرف کتاب سے نہیں اپنے عمل سے بھی دنیا والوں کو تعلیم دو۔ جب وہ اس دنیا سے اپنی جگہ خالی کر کے چلے جائیں گے تو ان کی خالی جگہ ایک سبق بن جائے گی۔ سبق تو پڑھنے والوں کے لئے ہوتا ہے نا۔ جو نہ پڑھ سکیں ہم ان کی بات نہیں کرتے۔"

رانی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ان کی جگہ خالی نہیں ہو گی۔ میں علاج کے لئے رقم دوں گی۔"

مالتی نے اسے غور سے دیکھا پھر پوچھا۔ "تم کہاں سے دو گی؟" ابھی تم نے کہا تھا کہ اب تم دولت مند باپ کی بیٹی نہیں رہی ہو۔"

"دیکھو مالتی! تم جائز رقم لے سکتی ہو وہ مجھ سے لے لو تمہارے پتی کے اصولوں کو ٹھیس نہیں پہنچے گی۔"

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں کسی سے قرض نہیں لے سکتی۔ یہ ہزار دو ہزار کی بات نہیں ہے۔ امریکہ جا کر علاج کرانے میں لگ بھگ ڈیڑھ لاکھ روپے خرچ ہوں گے اتنا بڑا قرض لے کر ہم ادا کیسے کریں گے؟"

"ادائیگی کی فکر نہ کرو۔"

"کیسے نہ کروں؟ کیا تم اتنی بڑی رقم ایسے ہی اٹھا کر دے دو گی؟"

رانی نے پوچھا۔ "کیا ایک بہن دوسری بہن کے برے وقت میں کام نہیں آتی

؟"

"آتی ہے' مگر میرے پتی اپنی حیثیت سے زیادہ مدد قبول نہیں کریں گے۔"

"چلو میں ان سے بات کرتی ہوں کیا اپنے پتی سے نہیں ملاؤ گی؟"

"ہاں ضرور۔ آؤ۔" مالتی نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دوسرے کمرے میں پر
دیناناتھ بستر پر لیٹے ہوئے تھے' دوسرے رشتے دار آس پاس بیٹھے ہوئے باتیں کر
تھے۔ پروفیسر دونوں کو دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ رانی نے نمستے کرتے ہوئے
"آپ آرام سے لیٹے رہیں میرے لئے تکلیف نہ کریں۔"

پروفیسر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کیا میں صورت سے بیمار لگ رہا ہوں
یہ مالتی خواہ مخواہ رو رو کر میری بیماری کی پبلسٹی کر رہی ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "میرا نام رانی ہے میں کالج کے زمانے سے مالتی کی
ہوں۔"

"میرا نام دیناناتھ ہے میں تمہاری مالتی کا وہ ہوں۔ دیکھو وہ کہنے سے یہ کیسے
رہی ہے۔"

مالتی واقعی شرما رہی تھی۔ سب ہنسنے لگے رانی نے کہا۔ "آپ بہت زندہ دل
مالتی کو خوب ہنساتے ہوں گے۔"

مالتی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پروفیسر نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔
اپنی مالتی کو تمام عمر ہنسا سکتا ہوں چاہے عمر کتنی ہی تھوڑی کیوں نہ ہو۔ مگر اب
رہی ہے تو اس کے آنسو پونچھنے کے لئے میرے پاس رومال نہیں ہے۔"

مالتی یک بیک دھاڑیں مار کر پروفیسر کے قدموں پر گر پڑی۔ رانی نے اسے
سے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "پاگل ہوئی ہو۔ چلو اٹھو تمہارا تو فرض۔
پروفیسر جی کو حوصلہ دو مگر خود رو رہی ہو۔ اٹھو میں تمہارا دکھ دور کرنے آئی ہوں۔

پروفیسر نے رانی کو اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں بیٹھو۔
میرے سالے نے آکر بتایا تھا کہ ایک دیوی آئی ہے اور دعویٰ کرتی ہے کہ بھگوان
انہیں یہاں بھیجا ہے۔ ویسے بھگوان کا ایڈریس تو مجھے بھی معلوم ہوگیا ہے مگر
میرے جانے سے پہلے بتاؤ کہ بھگوان سے تمہاری کیا رشتے داری ہے؟"

رانی نے مسکرا کر کہا۔ "آپ کی گفتگو کا انداز بڑا ہی دلچسپ ہے بڑا ہی جاں



ہے۔ آپ کے سامنے کھڑی ہوئی موت کو پسینہ آرہا ہوگا۔ آپ انسانی حوصلوں کی زندہ
مثال ہیں۔ میں عقیدت سے سرجھکاتی ہوں۔"

اس نے سرجھکا دیا پھر بتانے لگی کہ وہ کس مقصد سے آئی ہے اور کس طرح ان
کے کام آنا چاہتی ہے۔ پروفیسر نے تمام باتیں توجہ سے سننے کے بعد کہا۔ "تم سچ مچ دیوی
ہو مگر میرا اور مالتی کا جواب وہی ہے ہم اپنی حیثیت سے بڑھ کر مدد قبول نہیں کریں
گے۔"

رانی نے کہا۔ "آپ اپنی حیثیت کے مطابق قرض ادا کرسکتے ہیں۔"

پروفیسر نے کہا۔ "میری آمدنی بہت کم ہے میں اگلے جنم تک بھی یہ رقم ادا نہیں
کرسکوں گا۔"

"کرسکتے ہیں۔ آپ موت کے سامنے جینے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور قرض اتارنے
کا حوصلہ نہیں کرسکتے؟ آپ لوگ اپنے اصولوں کے مطابق صرف ضد نہ کریں' زندہ
رہنے کا راستہ کہیں سے نکالیں۔"

تمام رشتے دار یکے بعد دیگرے کہنے لگے کہ دیوی جی ٹھیک کہتی ہیں۔ صرف
اصولوں پر ضد نہیں کرنا چاہئے۔ رانی کا دیا ہوا قرض اکیلے پروفیسر صاحب نہیں بلکہ
تمام رشتے دار مل کر ادا کریں گے۔ سب مل کر تھوڑا تھوڑا دکھ بانٹ لیں گے۔ اپنی
محنت کا تھوڑا تھوڑا پسینہ قرض کی جھولی میں ڈالیں گے محنت کے پسینے سے جلد ہی
سمندر بن جاتا ہے۔

سب نے مل کر پروفیسر کو مجبور کیا تو وہ سرجھکا کر بولے۔ "انسانوں میں جب سچائی
کے نیک جذبے ابھرتے ہوں تو مجھے ان کا راستہ نہیں روکنا چاہئے۔ میں مانتا ہوں کہ
ہم سب مل کر آسانی سے اتنا بڑا قرض ادا کردیں گے اور دنیا والوں کو اکائی کی طاقت کا
سبق سکھائیں گے لیکن..........."

سب انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے' وہ بولے۔ "رانی بہن مجھے معلوم ہونا
چاہئے کہ اتنی بڑی رقم تم کہاں سے لاؤ گی؟ میں پہلے اطمینان حاصل کروں گا کہ وہ رقم
کسی کھوٹے راستے سے نہیں آئی ہے۔ تم برا نہ ماننا۔"

"میں صاف اور کھری باتوں کا برا نہیں مانتی۔ آپ کو وہ رقم کھرے راستے سے
ملے گی۔ میرے پوجا کے کمرے میں شری کرشن بھگوان کی مورتی ہے اس مورتی کے

قدموں میں پچھلے ڈیڑھ سال سے وہ دولت چھپی ہوئی ہے کل صبح پوجا کے بعد میں آ
لوگوں کے سامنے بھگوان کے چرنوں سے وہ دولت نکالوں گی' اس کے بعد تو کوئی
نہیں رہے گا نا؟"

سب لوگوں کو چپ لگ گئی۔ تمام آنکھیں رانی کو عقیدت سے دیکھ رہی تھیں
بھگوان نے سچ مچ ایک دیوی کو ان کے پاس بھیج دیا تھا۔ مالتی نے محبت سے اس کا ہا
تھام لیا۔ اب وہ خوشی کے مارے رو رہی تھی۔ پروفیسر دینا ناتھ نے کہا۔ "سمجھا جا
تو یہ میری زندگی بچانے کی بات نہیں ہے بلکہ بھگوان کو زندہ رکھنے کا مسئلہ ہے۔ جب
تک تہذیب کی رگوں میں زہریلا خون دوڑتا رہے گا بھگوان کی زندگی خطرے میں رہے
گی جب تک رانی جیسی بہنیں خون کا زہر نچوڑتی رہیں گی بھگوان کو کبھی کینسر نہیں
ہو گا۔ دھرم ہمیشہ زندہ رہے گا۔"

☆======☆======☆

بلراج بہت دیر تک کار کے اندر بیٹھا رانی کا انتظار کرتا رہا۔ دو گھنٹے گزر گئے۔ و
ڈیش بورڈ سے بوتل نکال کر پینے لگا۔ دو گشتی سپاہیوں نے اسے ٹوکا۔ اس نے دونوں ک
دس دس کا ایک نوٹ دے کر چلتا کر دیا ٹھیک دو بجے رانی واپس آگئی۔

وہ جلدی سے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ "میں تو پریشان ہوتا رہا اتنی دیر
تک کیا کر رہی تھیں؟"

"تمہارا کام بنا رہی تھی۔" وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

وہ اسٹیئرنگ سیٹ پر آکر بولا۔ "کام بن گیا؟"

"بن رہا ہے۔ وہ ایک شریف عورت ہے' کچھ وقت لگے گا۔"

اس نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔ پھر بھی کتنا وقت لگ سکتا ہے۔ اگلے
پندرہ دنوں میں مال یہاں پہنچنے والا ہے اس سے پہلے ہی مالتی کو............"

"بس آگے نہ بولو۔ میں اگلے دس دنوں میں مالتی کو تمہارے پاس پہنچا دوں
گی۔"

"جیو اور عیش کرو تم نے جی خوش کر دیا ہے' اسے کس طرح پھانس رہی ہو۔ کچھ
مجھے بھی بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں تقدیر تمہارا ساتھ دے رہی ہے۔ اس کے پتی کو بلڈ کینسر ہو گیا ہے۔"



"کیا سچ؟" بلراج خوشی سے کھل اٹھا۔ "پھر تو اسے علاج کے لئے بہت بڑی رقم
کی ضرورت ہو گی؟"

"ہاں میں نے اسے ڈیڑھ لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ کیا تم اور دھاون اتنی
رقم دے سکو گے؟"

"کیوں نہیں۔ دھاون تو اس کے لئے لاکھوں روپے کی کار اور کوٹھی خریدنے
کے لئے تیار ہے۔ وہ نقد رقم دے دے گا۔ مگر اس ہاتھ دینے اور اس ہاتھ لینے والی
بات ہو گی۔"

"ایسا ہی ہو گا جب وہ تم لوگوں کے پاس پہنچے گی تب اس کے ہاتھوں میں وہ رقم
رکھ دینا۔"

"ذرا جلدی ہی اسے پہنچانے کی کوشش کرو۔"

"کہہ دیا نا کہ دس دن کے اندر کام بن جائے گا۔"

"ٹھیک ہے تمہیں کتنی رقم دوں؟"

"تم میری وہ تصویریں واپس کر دو یہی میرا معاوضہ ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "تصویروں کو بھول جاؤ۔ ہمیں کبھی کبھی تمہاری کمزوریوں
سے کھیلنے میں مزہ آتا ہے۔"

وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "بلراج! میں صرف آنند کے ساتھ زندگی گزارنا
چاہتی ہوں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ گزرے دنوں کی میری تمام برائیاں اور
کمزوریاں مٹ جائیں۔ کوئی تحریر کوئی تصویر اور میری کوئی کہانی ایسی نہ ہو کہ آنند کو
شرمندہ ہونا پڑے۔"

"وہ تو تمہارے ساتھ جہاں جائے گا وہاں شرم سے نظریں جھکائے گا۔ تم میرے
پاس رکھی ہوئی چند تصویریں جلا کر اپنے ماضی کو نہیں جلا سکتیں' آنند بڑا احمق ہے۔ وہ
تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ خود اپنے آپ کو بگاڑ رہا ہے۔ اگر کبھی اس سے تمہاری اولاد
ہو گی اور اس اولاد کو بھی تمہارا کچا چٹھا معلوم ہو گا تو وہ تم پر تھوک دے گی یا تمہیں
قتل کر دے گی مگر تمہیں ماں نہیں کہے گی۔ یاد رکھو جو عورت شوہر کی موجودگی میں یار
بناتی ہے اسے قدم قدم پر ایک نیا یار ضرور ملتا ہے مگر شوہر اور بچوں کا پیار کبھی نہیں
ملتا۔ چاہے تم کتنے روپ بدل لو۔ چاہے ساری زندگی بھگوان کے سامنے سر پٹختی رہو

بھگوان بھی اس عورت کی تقدیر نہیں بدل سکتا جو پرائے مردوں سے اپنی تقدیر لا
چکی ہو۔"

وہ گم صم بیٹھی سن رہی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑ رہا تھا۔ گالیاں
والوں کی جو حالت ہوتی ہے وہی اس کی حالت تھی۔ جب سے وہ راہ راست پر
آرہی تھی۔ تب سے اسے روحانی سکول تو مل رہا تھا مگر دماغی پریشانیاں بڑھ رہی تھی
کیونکہ کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی پرانا پاپی مل جاتا اور اسے پاپ کے لئے پکارتا تھا اس
انکار پر کوئی اس کا مذاق اُڑاتا تھا کوئی فحش گالی دیتا تھا اور کوئی اس کے منہ پر سگریٹ
دھواں چھوڑ کر چلا جاتا تھا۔ وہ بڑی آزمائشوں سے گزرتی جارہی تھی۔

بلراج نے کالونی کے بس اسٹاپ پر کار روکتے ہوئے پوچھا۔ "پھر کب ملو گی؟"

وہ کار سے اترتے ہوئے بولی۔ "جب کام بن جائے گا۔"

"مجھے صبح و شام رپورٹ ملنی چاہئے کہ تم مالتی کو کس طرح [illegible] رہی ہو۔ وہ
ضرورت مند ہے میرا خیال ہے۔ دو چار روز میں مان جائے گی۔"

"میں کہہ چکی ہوں کہ وہ ایک شریف عورت ہے۔ ابھی اس کے اندر ضرورت
اور شرافت کی جنگ جاری ہے۔ میں ضرورت کے ہتھیاروں کو تیز کرتی رہوں گی۔ تم
جلدی نہ کرو۔ اگر تم اپنی طرف سے کوئی قدم اٹھاؤ گے۔ اسے اغوا کرو گے تو وہ خود
کشی کرلے گی۔"

"ٹھیک ہے میں اپنے آدمیوں کو مالتی سے دور رکھوں گا۔"

"تم بھی مالتی سے اور مجھ سے دور رہو گے۔ کل صبح وہ اپنے پتی کے ساتھ
میرے گھر آئے گی۔ آئندہ بھی آنا جانا رہے گا۔ اگر اس نے تمہیں میرے ساتھ دیکھ
لیا تو سمجھ جائے گی کہ باقاعدہ پلاننگ سے اسے پھانسا جارہا ہے سمجھ گئے نا؟"

"سمجھ گیا۔ تمہارے پاس میرے گھر اور دفتر کے فون نمبر ہیں۔ تم فون کے
ذریعے اپنی پراگریس کی اطلاع دے سکتی ہو۔ اوکے۔"

وہ کار اسٹارٹ کرکے چلا گیا۔ ذرا دور فٹ پاتھ پر اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں
نوجوان لڑکے کوڈی کھیل رہے تھے۔ رانی کو دیکھ کر انہوں نے کھیل چھوڑ دیا۔ ایک
نے منہ میں انگلیاں ڈال کر سیٹی بجائی۔ رانی نے ادھر دیکھا پھر گھر کی طرف جانے لگی۔
ایک نے کہا۔ "ہائے کیا چال ہے۔"



وہ رک گئی۔ انہیں گھور کر دیکھا لڑکے چپ ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ایک
نے ڈھٹائی سے کہا۔ "ارے ڈرتے کیوں ہو۔ یہ کوئی ستی ساوتری نہیں ہے۔ اتنی
رات کو کسی یار کی گاڑی میں آئی ہے۔"

دوسرے لڑکے نے ایک ہائے کے ساتھ کہا۔ "ہمارے پاس گاڑی نہیں ہے دل
تو ہے۔"

رانی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ وہ سب فوراً اٹھ کر
کھڑے ہوگئے۔ وہ جوان تھے۔ رانی کے مقابلے میں اچھے قد آور بھی تھے۔ مگر رانی
تجربات کی بھٹی میں تپ کر کندن بنی ہوئی تھی۔ اس نے گہری سنجیدگی سے ایک ایک کو
دیکھا پھر بڑی گمبھیرتا سے بولی۔ "مجھے بھی گاڑی والوں کی نہیں دل والوں کی ضرورت
ہے۔ یہاں جو دل والا ہے وہ میرے پیچھے آئے میں اس کے لئے اپنے گھر کا دروازہ کھلا
رکھوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی۔ پھر پیچھے دیکھے بغیر اپنے گھر کی طرف جانے لگی اسے اپنے
آپ پر مکمل اعتماد تھا۔ وہ کسی کنواری لڑکی کی طرح بدمعاشوں کی دھونس میں نہیں
آسکتی تھی اس نے گھر تک پہنچ کر تالے کو کھولا۔ پھر دروازے کے دونوں پٹ کھول کر
اندر چلی گئی۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنا ضروری نہیں سمجھا۔

وہ پوجا کے کمرے میں آئی اور بھگوان کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گئی۔
رات کے تین بج چکے تھے۔ اسے نیند نہیں آسکتی تھی۔ کئی باتیں دماغ میں گونج رہی
تھیں۔ مالتی اور اس کے پتی کے کام آنے کی روحانی خوشی تھی۔ یہ احتیاط بھی لازم
تھی کہ پروفیسر دیناناتھ کے امریکہ جانے تک بلراج کو خوش فہمی میں مبتلا رکھا جائے۔
پھر اس کا دماغ اس مبارک دن کے متعلق سوچتا رہا تھا۔ جب آنند پھر سے اسے قبول
کرلے گا اور جب وہ تصور میں دیکھتی کہ آنند نے اسے گلے لگالیا ہے تب بہت ساری
رسوائیاں بھی گلے لگتی دکھائی دیتی تھیں۔ لوگ آنند کو طعنے دیتے تھے۔ اس کی دھرم
پتنی کو بازاری کہتے تھے اور اس کی اولاد کو آنند کی نہیں پورے بازار کی اولاد کہتے
تھے۔

وہ اندر سے بڑے کرب میں مبتلا رہتی تھی۔ کبھی فیصلہ کرتی تھی کہ آنند سے دور
رہے گی۔ بھگوان بھی دور رہتا ہے صرف اس کی مورتی سامنے ہوتی ہے۔ وہ آنند کی

تصویر کو پوج لیا کرے گی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا دوسروں کے لئے قربانی دینا سیکھو تبھی من
شانتی ملے گی۔ اس سے بڑی قربانی کیا ہوگی کہ وہ آنند کی بھلائی کے لئے اور عزت
زندگی گزارنے کے لئے اسے اس کے حال پر چھوڑ دے۔ اب اسے سینتا مل گئی تھی
وہ اپنے محبوب کی گرتی ہوئی حالت کو سنبھال لے گی۔

وہ مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کئے کتنی ہی باتیں سوچتی رہی۔
وقت گزر رہا تھا صبح ہونے لگی۔ باہر کا دروازہ پوری طرح کھلا رہا۔ شاید وہ جوان لڑکے
آئے ہوں گے اور اسے بھگتی کی حالت میں دیکھ کر شرمندہ ہو کر چلے گئے ہوں گے۔

رات گزر گئی۔ دن کی روشنی کھلے ہوئے دروازے سے اندر آنے لگی۔
دوسرے کمرے سے مالتی نے آواز دی۔ "رانی تم کہاں ہو؟"

پھر وہ پوجا کے کمرے میں آکر بولی۔ "ارے یہ تو یہاں سو رہی ہے۔"

آہستہ آہستہ رانی کا دماغ جاگنے لگا اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا مالتی اس پر
جھکی ہوئی کہہ رہی تھی۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنی بدل گئی ہو بستر چھوڑ کر
بھگوان کے قدموں میں سونے لگی ہو۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پروفیسر دینا ناتھ دوسرے کمرے سے پوچھ رہے
تھے۔ "تعجب ہے تم گھر کا دروازہ کھلا رکھ کر سوتی ہو؟"

وہ سر پر آنچل رکھ کر بولی۔ "میرے گھر میں چوروں کے لئے کچھ نہیں ہے، رہ
گئی وہ دولت جو آپ کی امانت ہے اس کی حفاظت بھگوان کرتے ہیں۔" وہ اٹھ کر
کھڑی ہو گئی مالتی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "چلو پہلے ناشتہ تیار کریں۔"

"دن کے دس بج چکے ہیں ناشتے کا وقت گزر چکا ہے۔"

رانی نے کہا۔ "اچھا میں غسل کرلوں پھر مورتی کو ہاتھ لگاؤں گی۔"

وہ غسل کرنے گئی۔ مالتی باورچی خانے میں جاکر اس کے لئے ناشتہ تیار کرنے
لگی۔ غسل خانے اور باورچی خانے کے درمیان ایک دیوار تھی۔ دونوں طرف کی
آوازیں سنی جاسکتی تھیں۔ مالتی نے کہا۔ "رانی! تم کار سے نیچے پاؤں نہیں رکھتی
تھیں۔ فوم کے بستر پر سوتی تھیں۔ بھڑکیلے لباس پہنتی تھیں، اب کیا ہوا؟ تم اتنی بدل
کیوں گئی ہو؟"

وہ دوسری طرف سے بولی۔ "تقدیر نے بدل دیا ہے۔ پتاجی کا دیہانت ہوتے ہی



ہمارا کاروبار ختم ہوگیا۔ ہم اتنے مقروض ہوگئے کہ کوٹھی اور کاریں نیلام ہوگئیں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ تم پر اتنا برا وقت آیا، آنند جی کہاں ہیں؟"

رانی گڑبڑا گئی۔ کچھ تو جواب دینا ہی تھا، وہ بولی۔ "کاروبار کے سلسلے میں بمبئی
گئے ہیں۔"

"تمہارے گھر کی سادگی سے پتہ چل رہا ہے کہ کاروبار ٹھیک نہیں چل رہا ہے۔"

"ٹھیک ہی چل رہا ہے۔ دراصل آنند سادگی پسند کرتے ہیں۔"

"برا نہ جاننا۔ اس گھر کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کرسکتا کہ یہاں ڈیڑھ لاکھ روپے
ہوں گے۔"

رانی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ "ہاں کوئی یقین نہیں کرسکتا اسی لئے میں دروازہ
کھلا رکھتی ہوں، ویسے یہاں ڈیڑھ لاکھ سے بھی زیادہ رقم ہے۔ سیدھی سادی زندگی
گزارنے سے بچت ہی بچت ہوتی ہے۔"

حقیقتاً رانی کے پاس اس وقت کی رقم تھی جب اس نے زیورات بیچ کر آنند کو
کاروبار کرنے کا موقع دیا تھا۔ آنند نے جو رقم کاروبار میں لگائی تھی اس سے چار گنا
منافع حاصل کرکے رانی کو تقریباً پانچ لاکھ روپے دیئے تھے۔ تین برس کے دوران
سادگی سے زندگی گزار کر اس نے صرف بیس ہزار روپے خرچ کئے تھے باقی رقم ابھی
تک محفوظ تھی۔

وہ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر کمرے میں آئی۔ ناشتہ کیا۔ پھر ان کے ساتھ پوجا
کے کمرے میں آکر بھگوان کی مورتی کو اٹھایا۔ نیچے ایک چھوٹی سی آہنی تجوری تھی جس
پر بھگوان کھڑے مرلی بجاتے رہتے تھے۔ وہ تجوری کے پٹ کو اوپر اٹھا کر بولی۔ "جیجا
جی! اس میں پچیس پچیس ہزار کی گڈیاں ہیں، آپ چھ گڈیاں نکال لیں۔"

پروفیسر دینا ناتھ ہچکچا رہے تھے۔ سر جھکائے کھڑے تھے۔ مالتی نے پوچھا۔ "تم
آنندجی سے پوچھے بغیر ہمیں اتنی بڑی رقم دے رہی ہو؟"

"مالتی! تم آنند کو اچھی طرح جانتی ہو، ایک تو وہ چھوٹے دل کے نہیں ہیں،
دوسرے یہ کہ وہ تمہیں اور سینتا کو بے حد چاہتے ہیں۔ ان سے پوچھنے کا سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا۔"

پروفیسر نے کہا۔ "پھر بھی پوچھ لینا بہتر ہے ہم آنند صاحب کا انتظار کریں گے۔"

رانی نے کہا۔ "جی نہیں' وہ پندرہ دن سے پہلے نہیں آئیں گے اور آپ کو
دو چار دنوں میں یہاں سے چلے جانا چاہئے' اگر آپ نے ان کے انتظار میں دیر کی تو وہ
مجھ پر ناراض ہوں گے۔ مالتی تم آکر رقم نکالو۔"

مالتی نے آگے بڑھ کر تجوری میں ہاتھ ڈالا۔ پھر ایک ایک کر کے چھ گڈیاں نکال
لیں' اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ رانی نے تجوری بند کی پھر اس پر پہلے کی طرح کپڑا
بچھا کر بھگوان کی مورتی کو کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا تو پروفیسر دینا
ناتھ سر جھکائے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوئے تھے۔ رانی نے ان کے ہاتھ
تھام کر کہا۔ "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ میں آپ سے چھوٹی ہوں۔"

"میری بہن! تم اتنی بڑی ہو کہ تمہارے سامنے میرا سر نہیں اٹھے گا۔"

مالتی نے بھیگی آنکھوں سے رانی کو دیکھا اور کہا۔ "میری ماں نے مجھے ایک بار
سہاگن بنا کے میکے سے رخصت کیا تھا۔ دوسری بار تم مجھے سہاگن بنا رہی ہو۔ آج میں
تمہارے گھر سے جہیز میں اپنے پتی کی زندگی لیے جا رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اس کے قدموں میں جھکنا چاہتی تھی۔ رانی نے اسے کھینچ کر گلے
لگا لیا۔ مالتی رونے لگی رانی سوچنے لگی۔ "ڈاکٹر مجھے سرٹیفکیٹ کیا دے گا مالتی کے بہتے
آنسو اس بات کا ثبوت ہیں کہ میں نارمل ہو چکی ہوں۔"

☆======☆======☆

بلراج ریوالونگ چیئر پر بیٹھا کسی سے فون پر باتیں کر رہا تھا ایک خوبصورت سی
سیکرٹری ہاتھوں میں فائل اٹھائے میز کے پاس کھڑی تھی۔ اتنے میں دفتر کا دروازہ کھلا
کالا کلوٹا دیو قامت دھاون بتیسی نکالے اندر آیا۔ اس نے جانی کا نعرہ لگاتے ہوئے
پوچھا۔ "جانی! کس سے باتیں ہو رہی ہیں؟"

بلراج نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ایک ٹھیکہ ملنے والا ہے۔ پلیز ایک
منٹ خاموش رہو۔"

وہ پھر فون پر باتیں کرنے لگا۔ دھاون نے سیکرٹری کو دیکھا۔

لڑکی نے ہچکچاتے ہوئے اپنے باس بلراج کو دیکھا۔ وہ دوبارہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ
رکھ کر بولا۔ "یہ اپنا دھاون ہے اس کے لئے بوتل نکالو۔"

وہ پھر فون کی طرف متوجہ ہوا۔ لڑکی دھاون کو دیکھ کر اس بار مسکرائی۔ فریج



کے پاس گئی پھر اسے کھول کر بوتل اور دو گلاس نکالنے لگی۔ تھوڑی دیر میں وہ دھاون
کو بھرا ہوا گلاس پیش کر رہی تھی۔ اس نے دوسرا گلاس بلراج کے آگے میز پر رکھا۔
بلراج نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر کہا۔ "ایک بہت بڑا ٹھیکہ مل رہا ہے مگر
دوسری طرف تمہارا مال بھی پہنچنے والا ہے۔ میں دو طرف دھیان نہیں دے سکتا۔ وہ
ٹھیکہ چھوڑ دوں گا صرف تمہارا مال اٹھاؤں گا میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ بات
پکی ہو جائے۔"

دھاون نے چند گھونٹ پینے کے بعد کہا۔ "بات پکی ہے۔ بس وہی شرط پوری
کر دو۔"

"تم اسے حاصل کرنے کے لئے کتنی رقم خرچ کر سکتے ہو؟"

"جتنی پر وہ راضی ہو جائے۔"

"اس نے تمہارے پچیس ہزار کو ٹھکرا دیا تھا۔ جو عورت پیسوں کے آگے مجبور
نہیں ہوتی اسے برے حالات مجبور کر کے جھکا دیتے ہیں اس کے پتی کو کینسر ہو گیا ہے۔"

"وہ مارا۔" دھاون نے خوش ہو کر کہا۔ "سالا کب تک مرے گا؟"

"اس کے علاج کے لئے ڈیڑھ لاکھ خرچ ہو گا۔"

وہ دو گھونٹ پی کر بولا۔ "یعنی اب مالتی کی شرافت کو کینسر ہو گیا ہے۔ ڈیڑھ لاکھ
روپے کا۔"

"ہاں' اس کا پتی امریکہ جائے گا کیا تم اتنی رقم دو گے؟"

"ایک شرط پر۔" وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "جب تک وہ سالا امریکہ میں رہے گا' یہ
سالی میرے پاس رہے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں رانی سے کہوں گا کہ اسی طرح معاملہ طے کرے۔"

دھاون نے چونک کر پوچھا۔ "کون رانی؟ کیا وہ سیٹھ رادھے شیام کی بیٹی؟"

بلراج نے اثبات میں سر ہلایا پھر گلاس اٹھا لیا۔ دھاون نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ
کر کہا۔ "کس قیامت کا نام لے لیا۔ میں نے ایک بار رانی کو دیکھا تھا پھر اسے آج تک
نہ بھلا سکا۔ پولیس والوں نے مجھے یہاں پاؤں جمانے کا موقع دیا ہوتا تو میں اسے تم سے
چھین کر لے جاتا۔"

بلراج ہنسنے لگا۔ "وہ مجھ سے بھی چھن گئی ہے جوگن بن گئی ہے۔ صرف اپنے پتی کی

مالا جپتی ہے اس کی بات چھوڑو۔"

"اچھی چیز کو چھوڑنا گناہ ہے جانی!"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ بلراج نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو۔" پھر دوسری طرف کی آواز سن کر بولا۔ "رانی! اچھا ذرا ایک منٹ۔"

وہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر دھاون سے بولا۔ "سالی بہت دن جئے گی، ابھی ہم اس کی باتیں کر رہے تھے۔"

دھاون نے کہا۔ "جانی! مجھے بھی ریسیور دینا۔ میں دو باتیں کروں گا۔"

وہ پینے لگا۔ بلراج نے فون پر کہا۔ "ہیلو رانی! بات کہاں تک پہنچی؟"

رانی نے جواب دیا۔ "آج صبح وہ میرے گھر آئی تھی۔ بہت ضرورت مند ہے سمجھ لو کہ وہ راضی ہے بس ذرا شرما رہی ہے۔ اصل چیز شرم ہے اسے بے شرم بنانے میں دو چار روز لگ جائیں گے۔"

"چلو ٹھیک ہے مگر ایک بات سوچو ڈیڑھ لاکھ بڑے ہوتے ہیں مالتی کو سمجھاؤ کہ بہت لے کر دوستی بھی بہت کرنی چاہئے۔ دھاون اتنا احمق نہیں ہے کہ صرف ایک جام کے لئے اتنا لٹا دے۔"

"تم اپنے دھاون کو سمجھاؤ کہ وہ بہت کا لالچ کر کے تھوڑے سے بھی جائے گا۔ وہ مالتی ہے کوئی بے شرم عورت نہیں ہے۔"

بلراج نے کچھ سوچ کر کہا۔ "ٹھیک ہے وہ ایک ہی بار آئے، ہم اسے بار بار بلیک میل کرنے کے انتظامات کر لیں گے۔"

"ہاں جیسا میرے ساتھ کر چکے ہو۔ بڑے کمینے ہو تم۔"

بلراج نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "یہ اپنا دھاون یہاں بیٹھا ہے تم سے باتیں کرنا چاہتا ہے ذرا اس کے کانوں میں رس گھول دو۔"

دھاون نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور لیا پھر نشے کی ترنگ میں بولا۔ "ہیلو جانی! یاد ہے چار برس پہلے بلراج نے ہمیں ایک دوسرے سے متعارف کرایا تھا۔ اس وقت تم کلی تھیں سنا ہے پھول بن گئی ہو۔"

"ہاں ایسا پھول جو اپنے بھگوان کے چرنوں پر چڑھتا ہے۔"

"ارے ہم کیا منع کرتے ہیں؟"



وہ گالی دے کر بولی۔ "ایک اجنبی عورت سے ایسی باتیں کرتے شرم نہیں آتی؟"

"رانی! تم اجنبی نہیں ہو۔"

"رانی! کون رانی؟ اگر یہ کوئی نام ہے تو میں رانی نہیں ہوں۔"

"ایں!" دھاون نے بوکھلا کر نشیلی آنکھوں سے ریسیور کو دیکھا پھر پوچھا۔ "تم رانی نہیں ہو؟ مم مگر یہ سالا اپنا بلراج تو کہہ رہا تھا کہ تم.........."

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ریسیور بلراج کو دیتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا بدمعاشی ہے؟ تم نے کس عورت سے ٹانکا جوڑ دیا۔ یہ رانی نہیں ہے۔"

بلراج نے حیرانی سے ریسیور لے کر آواز دی۔ "ہیلو رانی! یہ کیا مذاق ہے؟"

دوسری طرف سے رابطہ ختم ہو چکا تھا۔ بلراج نے ہنستے ہوئے ریسیور کو رکھتے ہوئے کہا۔ "اس عورت نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ ہماری آواز سے پہچان گئی تھی کہ ہم پی رہے ہیں اس لئے تم کو اُلو بنا کر پیچھا چھڑا لیا۔ تمہیں سچ مچ چڑھ گئی ہے۔"

وہ اپنی کھوپڑی سہلاتے ہوئے بولا۔ "یہاں آنے سے پہلے میں نے چرس کا دم لگایا تھا مگر جانی! میں نشے میں نہیں ہوں۔ مجھے ایک بار رانی سے ملاؤ میں دیکھوں گا وہ کیسے اُلو بناتی ہے۔"

وہ تائید میں سر ہلا کر پینے لگا اتنے میں چپراسی نے اندر آ کر بلراج سے کہا۔ "مالک! آپ سے میٹھی دادا ملنا چاہتے ہیں۔"

بلراج نے سیکرٹری سے کہا۔ "تم جاؤ۔" چپراسی کو حکم دیا۔ "بھیج دو۔"

دھاون نے پوچھا۔ "یہ میٹھی دادا کون ہے؟"

"اپنے دھندے کا آدمی ہے ملکہ گنج میں اس کے دو افیون کے اڈے اور دیسی شراب کی ایک بھٹی ہے آدمی جی دار ہے۔ کسی کو قتل کر کے اس کی لاش پر بیٹھ کر بھوجن کر سکتا ہے۔"

"پھر تو بڑے کام کا آدمی ہے۔"

"ہاں میں نے اپنے کام کے لئے اسے بلایا ہے۔"

دونوں فوراً ہی چپ ہو گئے۔ دروازے پر قد آور لحیم شحیم میٹھی دادا کھڑا ہوا تھا۔ دھاون نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔ بلراج نے کہا۔ "آؤ دادا، دھندا کیسا چل

رہا ہے؟"

وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "پولیس والوں کی مہربانی ہے اچھا چل رہا ہے۔"

"بیٹھ جاؤ۔ میں نے انسپکٹر شرما سے کہہ دیا ہے کہ وہ کبھی تمہارے اڈوں کار
نہیں کرے گا۔"

میٹھی دادا نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ نہ بھی کہیں تب بھی شرما میرے پیچھے ز
ہلاتا رہے گا۔ پورے دہلی شہر میں پولیس کو مجھ سے زیادہ بھتہ کوئی نہیں دیتا۔ ویسے
آپ نے کیوں بلایا ہے؟"

بلراج نے ایک گھونٹ پی کر کہا۔ "میرا ایک کام ہے۔ کسی کو ترّی پار کرنا ہے۔"

"کس کو؟" میٹھی دادا نے میز پر جھک کر پوچھا۔

"ملکہ گنج سے پرے غریبوں کی ایک بستی ہے۔" اس نے پھر ایک گھونٹ حلق
سے اتارا۔ "وہاں ایک کھولی کے دروازے پر گھوڑا چھاپ بیڑی کا بورڈ لگا ہے۔"

میٹھی دادا سیدھا بیٹھتے ہوئے حیرانی سے بولا۔ "وہاں تو آنند بابو رہتے ہیں۔"

"ٹھیک سمجھے۔ تم آنند کو مجبور کرو کہ فوراً یہ شہر چھوڑ کر چلا جائے۔"

"کیوں؟"

"وہ میرا دشمن ہے۔ اگر شہر چھوڑنے پر راضی نہ ہو تو دنیا ہی چھڑا دو۔ اسے
ٹھکانے لگانے کا منہ مانگا معاوضہ ملے گے۔"

میٹھی دادا کرسی پر سے آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر دونوں ہاتھ میز پر ٹیک
کر غراتے ہوئے سوال کیا۔ "تمہیں آنند سے کیا دشمنی ہے سیٹھ!"

بلراج نے میز پر خالی گلاس رکھتے ہوئے کہا۔ "تم کام کرو۔ سوال نہ کرو۔"

میٹھی دادا نے اچانک ہی میز پر گھونسہ مارتے ہوئے اور دھاڑتے ہوئے کہا۔
"میری بات کا جواب دو' آنند بابو سے کیا دشمنی ہے؟"

اس کے گھونسے سے پوری میز پر زلزلہ آ گیا۔ وہاں رکھی ہوئی کتنی ہی چیزیں
اچھل کر پھر اپنی جگہ ٹھہر گئیں۔ دھاون نے ایک جھٹکے سے اٹھ کر غصے سے کہا۔ "ب
ایڈیٹ تمہیں بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔"

وہ آگے اور کچھ نہ کہہ سکا۔ میٹھی دادا کا ایک زوردار ہاتھ اس کے منہ پر پڑا۔
وہ الٹ کر کرسی پر گرا۔ کرسی فرش پر گری۔ پھر وہ کرسی پر سے ہوتا ہوا ذرا دو



لڑھک گیا۔ دوسری طرف بلراج نے فوراً ہی اٹھتے ہوئے میز کی دراز کو کھولا لیکن اس
سے پہلے کہ وہ دراز کے اندر ہاتھ ڈالتا۔ میٹھی دادا نے دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر
قلابازی کھائی پھر بڑی سے میز پر سے پھسلتے ہوئے لکھنے پڑھنے کے سامان بوتل اور
گلاسوں کو منتشر کرتے ہوئے بلراج کے سینے پر ایک لات ماری وہ لڑکھڑا کر ریوالونگ
چیئر پر گرا اور گول گھومنے لگا۔

میٹھی دادا میز کے دوسرے افق پر پہنچ کر دراز سے ریوالور نکال چکا تھا۔ وہ اپنی
بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ "میں کئی بار ریوالور کو اس دراز میں دیکھ چکا ہوں۔ ہم
سب بدمعاش ہیں اور ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں
کہ ہم میں سے کوئی اس ریوالور کو یہاں استعمال نہیں کر سکے گا کیونکہ ہمارا دھندا ایک
ہے ہم میں سے ایک بھی قانون کی گرفت میں جائے گا تو دوسروں کی بھی شامت
آ جائے گی۔"

دھاون فرش پر سے اٹھ گیا۔ میٹھی دادا اس کے پاس آیا۔ پھر بلراج کی طرف
پلٹ کر بولا۔ "تم نے یہ ریوالور صرف مجھے دھونس میں لانے کے لئے نکالنا چاہا تھا۔
میں نے بھی صرف تماشا دکھایا ہے کہ ایسے موقع پر بجلی بن کر گرتا ہوں۔ بولو' یہ کھیل
کیسا لگا؟"

بلراج نے کھسیانے انداز میں مسکرا کر کہا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم سب قانون
سے کترا کر کوئی قدم اٹھاتے ہیں۔ میں صرف اس لئے ریوالور نکال رہا تھا کہ تم
دھاون پر دوسرا حملہ نہ کرو۔ میں تمہیں لڑائی جھگڑے سے باز رکھنا چاہتا تھا۔"

دھاون نے بھی کہا۔ "ہاں دادا یہ ریوالور ہاتھی کا دانت ہے دکھانے کے لئے
ہے استعمال کرنے کے لئے نہیں ہے اسے بلراج کو واپس کر دو۔ ہم دوست ہیں۔"

میٹھی دادا نے ریوالور کا رخ بلراج کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ "مگر ہماری زندگی
میں ایسے موقعے بھی آتے ہیں جب ہم اپنی گرفتاری اور سزائے موت کی بھی پروا نہیں
کرتے اور گولی چلا دیتے ہیں۔ ابھی ایسا ہی برا وقت تم پر آیا ہے سیٹھ! اگر تم نے آنند
بابو سے دشمنی کی وجہ نہ بتائی تو میں تین تک گنتے ہی تمہاری کھوپڑی میں سوراخ
کر دوں گا۔ ایک.........."

اس نے ایسی کڑکتی آواز میں گنتی شروع کی تھی کہ بلراج لرز کر کرسی سے اٹھ

گیا۔ "بتاتا ہوں۔ ابھی بتاتا ہوں۔ مگر ایک بات تم مجھے بتا دو' کیا آنند تمہارا کچھ ہے؟"

"وہ میرے کچھ بھی نہیں ہیں مگر سب کچھ ہیں۔ ہم بدمعاشوں میں ایک خوبی ہے کہ کسی بھی شریف آدمی کا احسان کبھی نہیں بھولتے۔ ایک بار آنند بابو نے میری جان بچائی تھی۔ میں ان کا قرضدار ہوں اور ان کی جان بچانے کے لئے کیا کر سکتا ہوں تم دیکھ رہے ہو۔ کیا میں ادھوری گنتی پوری کروں؟"

"نہیں۔" بلراج نے دور ہی سے روکنے کے انداز میں ہاتھ بڑھایا۔ "سنو دادا اگر آنند نے کبھی تمہاری جان بچائی تھی تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مہاتما ہے۔ اس کی نیچ عادتوں کو نہیں جانتے وہ میری بیوی کو بہلا پھسلا کر اس کی عزت سے چاہتا ہے۔ وہ پتہ نہیں کیا منتر پڑھتا ہے کہ میری بیوی اس کے پاس چلی جاتی ہے۔"

"تو پھر یہ تمہاری بیوی کا قصور ہوا۔ گولی آنند بابو کو نہیں تمہاری عورت کو مارتا.........." میٹھی دادا بولتے بولتے رک گیا۔ اسے سنیتا یاد آ گئی۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر بلراج کو دیکھا پھر اسے ایک انگلی دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "اے سیٹھ! کیا تم دیوی کی بات کر رہے ہو؟"

وہ جلدی سے بولا۔ "ہاں سنیتا میری دھرم پتنی ہے۔"

میٹھی دادا نے اسے نفرت سے دیکھا۔ کچھ سوچا پھر ریوالور کی نال نیچی کرتے ہوئے کہا۔ "سیٹھ بڑی تقدیر والے ہو آج میرے ہاتھ سے بچ گئے۔ میں ایک دیوی کا سہاگ نہیں اجاڑ سکتا۔"

بلراج نے اطمینان کی سانس لی پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اب اس قصے کو ختم کرو۔"

"قصہ تو ابھی شروع ہوا ہے تم آنند بابو سے دشمنی ظاہر کرو اور میں آرام سے کہیں جا کر بیٹھ جاؤں یہ کبھی نہیں ہوگا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب آنند کو دشمن نہیں سمجھوں گا۔"

"سیٹھ میں بچہ نہیں ہوں۔ پہلے دشمنی کی وجہ کو ختم کرنا ہوگا۔ آنند بابو اور سنیتا دیوی کا پریم پاک ہے یہ محبت ختم نہیں ہوگی تمہاری دشمنی بھی برقرار رہے گی۔ فیصلہ کیسے ہوگا' بولو۔"



"میں اپنی بیوی کو اس کے حال پر چھوڑ دوں گا' وہ اپنا اچھا برا خود سمجھے گی۔"

"تمہارے جیسا آدمی جو رقابت کی آگ میں جلتا ہے وہ کبھی اپنی عورت کو اس کی مرضی پر نہیں چھوڑ سکتا۔"

"تو کیا میں اپنی بیوی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دوں؟ طلاق دے دوں؟"

"کاش ایسا ہو سکتا۔" میٹھی دادا نے کہا۔ "ان دونوں کی جوڑی اچھی ہے لیکن سنیتا دیوی جیسی عورتیں اپنی محبت کو اندر سے مارتی ہیں ا۔ پتی سے بے وفائی نہیں کرتیں۔ اپنے پتی کی زندگی میں کسی دوسرے مرد کو ہاتھ پکڑنے بھی نہیں دیتیں اور طلاق کو اپنی توہین سمجھتی ہیں سیٹھ اس دیوی کی قدر کرو ورنہ.........."

کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے بلراج اور دھاون کو دیکھا پھر ریوالور کے چیمبر سے گولیاں نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ جب تک میرے ہاتھ میں ہوگا تم لوگ بھیگی بلی بنے رہو گے' یہ لو۔"

اس نے میز پر ریوالور رکھ کر اسے بلراج کی طرف سرکا دیا۔ اس کی گولیاں اپنی جیب میں رکھ لیں۔ "میں جا رہا ہوں اس سے پہلے میری وارننگ سن لو۔ آنند بابو اور دیوی جی اپنی موت سے مریں تو کوئی بات نہیں سبھی کو ایک دن مرنا ہے لیکن انہیں کوئی حادثہ پیش آیا یا ان پر کسی نے قاتلانہ حملہ کیا تو وہ دن تمہارا آخری دن ہوگا۔"

بلراج نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "یہ کیسی باتیں کر رہے ہو دادا! سوچو اگر کسی دوسرے نے ان سے دشمنی کی تو.........."

"میں کچھ نہیں جانتا۔ ان کی زندگی تمہاری زندگی ہوگی اور ان کی موت تمہاری موت.........."

یہ کہتے ہی وہ پلٹ گیا پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو دھاون تیزی سے دروازے کے پاس آیا۔ باہر کی طرف دیکھ کر دروازے کو بند کیا پھر پلٹ کر غصے سے بولا۔ "تمہیں کس نے مشورہ دیا تھا کہ اپنے رقیب کو قتل کرانے کے لئے ایسے آدمی کا انتخاب کرو۔"

"میں نہیں جانتا کہ میٹھی دادا اس قدر آنند کا حمایتی نکلے گا۔ الٹی مصیبت گلے پڑ گئی ہے۔"

دھاون نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ "مصیبت کو تم نے گلے لگا رکھا ہے اور
مصیبت ہے سنیتا۔ کیا ضرورت ہے اسے بیوی بنا کر پالنے کی؟ ہمیں آئے دن طرح ط
کی لڑکیاں مل جاتی ہیں۔ ہم مہنگے سے مہنگے حسن خرید لیتے ہیں پھر یہ سنیتا سے چپک ا
رہنے کی کوئی معقول وجہ بتاؤ۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر ریوالونگ چیئر کی پشت سے ٹک گیا پھر بولا
"دھاون! یہ دنیا ساری کی ساری جھوٹی اور فریبی نہیں ہے مگر ہم سمجھ نہیں سکتے ک
سچائی کہاں ہے؟ اور کہاں ہم فریب سے بچ سکتے ہیں جب ہم سمجھ نہیں سکتے تو ایک گھ
بناتے ہیں اور اس میں اپنے بھروسے کی ایک عورت کو رکھتے ہیں۔ باہر ہم قدم قدم پر
جھوٹ بولتے ہیں۔ دوسروں کو فریب دیتے ہیں۔ دوسروں کی عورتوں سے کھیلتے ہیں۔
گھر میں آکر فخر کرتے ہیں کہ ہماری عورت دوسروں سے نہیں کھیلتی ہے۔"

دھاون نے پوچھا۔ "تم کیسے کہہ سکتے ہو سنیتا اور آنند بے حیائی نہیں کرتے
ہیں؟"

"بھروسا۔ دھاون! اگر کبھی تم کسی کو گھر والی بناؤ گے تو پتہ چلے گا کہ اپنی عورت
پر کس طرح بھروسا ہو جاتا ہے، بہت سی باتیں سمجھائی نہیں جاسکتیں تجربات سے سمجھ
میں آتی ہیں۔"

"بلراج! میں کوئی گھر والی پالنے سے پہلے مرجاؤں گا۔"

"تمہارے جیسے آدمی بہت کم ہوتے ہیں ورنہ کسی سے بھی پوچھ کر دیکھ لو انسان
کو ایک لمبی زندگی گزارنے کے لئے کسی پر بھروسا کرنا پڑتا ہے جس طرح میرا اپنا بنک
بیلنس ہے کوئی اسے خرچ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح میری اپنی ایک عورت بھی ہے کوئی
اسے چھو نہیں سکتا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ سنیتا خود کسی کو چھونے کی اجازت نہیں دے
گی لیکن آنند ہمارے جیسا مرد ہے وہ چھل کپٹ سے سنیتا کی عزت تک پہنچ سکتا ہے!
سنیتا کو بہکا کر مجھ سے چھین سکتا ہے۔ کیا تم اپنی دولت کسی کو دے سکتے ہو؟ نہیں دے
سکتے نا! اسی طرح میں سنیتا کو کسی کے حوالے نہیں کر سکتا۔ میں آنند اور میٹھی دادا کو قتل
کردوں گا۔"

دھاون نے افسوس کرنے کے انداز میں اسے دیکھا۔ پھر مایوسی سے سر ہلا کر کہا۔
"تمہارا کوئی علاج نہیں ہے میں نے آج تک اسی لئے شادی نہیں کی۔ عورت کوئی بھی



ہو بیوی بننے کے بعد مرد کو رفتہ رفتہ کمزور کر دیتی ہے تمہاری طرح۔"
یہ کہہ کر وہ اس سے منہ پھیر کر دفتر سے باہر چلا گیا۔

☆------☆------☆

یہ پچھلے دن کی بات ہے جب سنیتا آنند سے مل کر گئی تھی اور ایک بوتل سے
تھوڑی سی شراب چھوڑ گئی تھی۔ آنند نے وعدہ کیا تھا کہ وہ شراب سے پرہیز کرے
گا۔ پینے کی خواہش مچلنے لگے گی، تو سنیتا کو دیا ہوا وچن یاد کرے گا اور بوتل کو ہاتھ بھی
نہیں لگائے گا۔"

وعدہ کرنا آسان ہے مگر جس سے وعدہ کیا جائے وہ سامنے نہ ہو اور سامنے بوتل
ہو، بوتل میں بچی ہوئی پوا شراب للچا رہی ہو تو وعدہ ڈگمگا جاتا ہے۔

آنند نے بہت صبر کیا، اس نے سنیتا کی محبت میں ڈوب کر شراب کو گالی دی،
بوتل کی طرف سے منہ پھیر کر سونے کی کوشش کی۔ دل نے کہا بوتل کو نظروں سے
اوجھل کرنے سے کیا ہوتا ہے وہ بوتل تو اپنی جگہ ہی رہے گی اور جب تک گھر میں رہے
گی اس کی طلب پکارتی رہے گی۔

وہ بستر سے اٹھا۔ کرسی کے پیچھے رکھی ہوئی بوتل کو اٹھا کر باہر آیا۔ وہ بوتل کو
پھینک دینا چاہتا تھا مگر پورے ایک پوے کو پھینکتے ہوئے دل دکھنے لگا۔ اس نے
دروازے کے باہر بوتل رکھ دی۔ چلو آدمی نہ پئے، کتا ہی پی لے۔ اچھی چیز کو یونہی
نہیں پھینک دینا چاہئے۔ وہ بوتل کو باہر چھوڑ کر اندر آگیا۔

اندر پہنچ کر اس نے سنیتا کی تصویر کو میز پر سے اٹھایا۔ "سونی میں اپنا وعدہ نباہ رہا
ہوں۔ یہ درست ہے جو عادی پینے والے ہوتے ہیں وہ شراب کے بغیر نہیں رہ سکتے۔
یہ نہ ملے تو مرنے لگتے ہیں۔ میں بھی پی پی کر نہیں مروں گا۔ تمہاری خاطر بغیر پئے مرتا
رہوں گا۔"

اسے یاد آیا، سنیتا نے کہا تھا کہ اس بوتل میں وہ بچی ہوئی شراب ہمیشہ موجود رہے
تاکہ وہ پوا شراب اسے اس کا وعدہ یاد دلاتی رہے۔ اگر سنیتا نے آکر بوتل نہیں دیکھی
یا بوتل خالی نظر آئی تو یہی سمجھے گی کہ وعدے پر قائم نہیں رہا۔

وہ جلدی سے سنیتا کی تصویر کو میز پر رکھ کر باہر نکلا تو بوتل وہاں گری پڑی تھی اور
شراب زمین میں بہہ گئی تھی اس نے سوچا کہ وہ آئے گی تو اسے وعدہ وفا کرنے کا یقین

کیسے دلائے گا؟ اس بوتل میں اتنی ہی شراب موجود رہنی چاہئے۔

وہ فوراً ہی دروازہ بند کر کے شراب خانے پہنچا۔ شام بھیگ رہی تھی،
نوشوں کی الگ الگ محفلیں جم رہی تھیں۔ وہ ہر محفل کا خوب جانا پہچانا مے خوار تھا
وہاں پہنچ کر جب اس نے ایک پاؤ شراب طلب کی تو سب ہنسنے لگے ایک نے پوچھا
"کیا بات ہے بھیا، پینے کے لئے لے جاؤ گے یا سونگھنے کے لئے؟"

دوسرے نے کہا۔ "ارے سونگھنے کے لئے تو پوری دارو کی بھٹی بھی کافی نہیں
ہے آنند بابو اسے آنکھوں میں سرمے کی جگہ لگائیں گے۔"

چاروں طرف سے قہقہے بلند ہونے لگے۔ وہ ان قہقہوں کے درمیان سوڈا واٹر
گیس کی طرح ابل گیا۔ آدھی رات کو جب وہ شراب خانے سے باہر نکلا تو اس کے
ہاتھ میں بھری ہوئی بوتل تھی اور دو ساتھی اسے سہارا دے کر گھر پہنچا رہے تھے، اسے
یاد نہیں رہا کہ گھر کیسے پہنچا اور بستر پر کس نے پہنچایا۔ صبح نو بجے آنکھ کھلی تو ہوش میں
آکر اپنی غلطی کا علم ہوا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر غسل کیا صاف ستھرے کپڑے پہنے
تاکہ سینتا آئے تو بھید نہ کھلے۔"

بارہ بج گئے وہ نہیں آئی تب اس کی نظر چارپائی کے نیچے گئی۔ وہاں بھری ہوئی
بوتل رکھی تھی اور سینتا بوتل کے پاؤ حصے میں شراب دیکھ کر گئی تھی اس نے بوتل کو
وہاں سے نکال کر اسے دیکھا۔ سوچا پھر ایک فیصلے پر پہنچ کر اسے کھولا اور منہ سے لگالیا۔
فیصلہ یہ تھا کہ بوتل کا تین چوتھائی حصہ خالی ہو جائے اور پچھلے دن کی طرح صرف ایک
حصے میں شراب بچی رہے۔

ایک گھنٹے بعد جب اس نے بوتل کو دیکھا تو وہ ایک کے بجائے دو نظر آئیں دماغ
کے اندر نشہ پوچھ رہا تھا۔ "سالی دو کہاں سے آگئیں؟ سینتا کو صرف ایک دکھانا ہوگی
اس لئے دوسری کو فوراً خالی کیا جائے۔"

اس نے آنکھیں بند کیں۔ اپنی دانست میں دوسری بوتل اٹھائی اسے منہ سے
لگا کر خالی کیا۔ لڑکھڑاتا ہوا دروازے پر آیا پھر خالی بوتل باہر پھینک کر مطمئن ہوگیا۔
یوں غور کیا جائے تو نشہ صرف شراب میں نہیں ہوتا نشہ اپنے غلط عمل میں ہوتا ہے جو
شراب نہیں پیتے، نشے میں نہیں رہتے۔ ذاتی منافع کے لئے خوب سوچ سمجھ کر غلطی
کرتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سب سے تیز اور زود اثر نشہ اپنے غلط عمل میں



اور اپنی خوش فہمی میں ہے۔ یہ حقیقت اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب غلطی پکڑی
جاتی ہے۔

شام کو سینتا نے آکر آنند کو غور سے دیکھا۔ اپنی مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے
پوچھا۔ "وہ بوتل کہاں ہے؟"

اس وقت وہ مدہوش نہیں تھا خود پریشان تھا کہ بوتل کہاں چلی گئی۔ اس نے کہا۔
"میں دروازہ کھول کر سو رہا تھا۔ پتہ نہیں کون بوتل اٹھا کر لے گیا۔ تم یقین کرو میں
نے نہیں پی۔"

وہ بولی۔ "مجھے یقین ہے کہ ایک پاؤ شراب پینے سے نشہ نہیں ہوتا تم نے اتنی سی
پی ہوتی تو بوتل لے جانے والے کو روک دیتے کیونکہ وہ بوتل ہمارے درمیان اعتماد کو
بحال رکھنے والی تھی۔"

اس نے ندامت سے سر کو جھکالیا، وہ بولی۔ "آدمی غلطی کے بعد پچھتائے تو سمجھو
کہ اس میں سنبھلنے کا جذبہ زندہ ہے۔ میں اسی لیے رانی کی قدر کرتی ہوں۔ وہ غلطی
کرتی رہی پچھتاتی رہی۔ آخر سنبھلنے کے راستے پر چل نکلی۔ میں تم پر بھروسا کرتی ہوں
کہ تم آج کے بعد نہیں پیو گے۔"

وہ چپ رہا سینتا نے کہا۔ "میں یہاں زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گی میرے پتی کو میرے
یہاں آنے پر اعتراض ہے۔"

آنند نے سر اٹھا کر دیکھا پھر بڑی حسرت سے کہا۔ "میں رہ رہ کر اس حقیقت کو
بھول جاتا ہوں کہ تم پرائی ہو اور میں اتنے گندے ماحول میں غریبی کی زندگی گزار رہا
ہوں کہ کوئی بھی شخص اپنی عورت کو ادھر نہیں آنے دے گا۔"

"تم ایسے ماحول میں کیوں زندگی گزارتے ہو؟ تم تعلیم یافتہ ہو یہ سمجھنا چاہئے کہ
حالات کبھی آدمی کو بری طرح بگاڑ دیتے ہیں لیکن بگڑ کر بننے والے کو ہی انسان کہتے
ہیں۔ اٹھو آنند، ایک نئے حوصلے سے پھر ایک نئی زندگی کا آغاز کرو۔"

"سونی! جب اپنے لئے جینے کو جی نہیں چاہتا تو ہم دوسروں کے لئے زندہ رہتے
ہیں لیکن وہ دوسرا کون ہے جس کے لئے میں حوصلہ کروں؟"

"میں بتاؤں گی کہ وہ کون ہے تم پہلے حوصلہ کرو۔ وہ دوسری جو تمہاری زندگی
میں آنے والی ہے اس کے لئے تیاری شروع کرو۔"

آنند نے اسے ایک نئی امید سے دیکھا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں کل صبح آؤں گی۔"

"جب تمہارے پتی کو اعتراض ہے تو کیسے آؤ گی۔"

"میں غلط اعتراضات کو نہیں مانتی۔ میں آؤں گی اور آتی رہوں گی۔"

وہ خوشی سے کِھل گیا۔ سیتا دروازے کے پاس گئی پھر پوچھا۔ "کیا تم نئی زندگی شروع کرو گے؟"

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا' بڑے عزم سے بولا۔ "ہاں اور ابھی سے شروع کروں گا۔"

"تو پھر رانی سے ملو۔ میں تمہیں حوصلہ دے رہی ہوں۔ تم اسے حوصلہ دو۔ ہم دیئے سے دیا جلائیں گے۔"

وہ دیا جلانے سے پہلے بجھ گیا۔ سیتا باہر آکر اپنی کار میں بیٹھ گئی۔ وہ نادان نہیں تھی خوب سمجھتی تھی کہ آنند کیا چاہتا ہے؟ اور وہ سمجھانا چاہتی تھی کہ نئی چاہت کے لئے پرانی چاہت میں کیڑے نہیں نکالنا چاہئے۔ کیڑے اب نہیں رہے تھے آنند کو یہ تسلیم کرنا ہوگا۔

وہ کار اسٹارٹ کرکے جانا چاہتی تھی کہ عقب نما آئینے پر نظر پڑ گئی۔ اس آئینے میں اسے رانی کی جھلک دکھائی دی تھی۔ دوسرے ہی لمحے آئینہ خالی ہوگیا۔ رانی ایک دیوار کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ سیتا نے گاڑی کے انجن کو بند کیا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ پیچھے ایک دیوار کی جانب دیکھا پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہاں پہنچ گئی۔ دیوار کے پیچھے سفید ساری کا آنچل لہرایا پھر چھپ گیا۔

"رانی!" سیتا نے پیار سے پوچھا۔ "مجھ سے چھپ رہی ہو؟"

وہ دوسری طرف منہ پھیرے کھڑی تھی۔ انکار میں سر ہلا کر بولی "نہیں اپنے آپ سے چھپ رہی ہوں۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہیں منہ دکھاؤں۔"

سیتا نے سامنے آکر اس کے بازوؤں کو تھام لیا پھر کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ ہم سب اپنے اندر کی برائیوں کو مارنے کی مشق کرتے رہیں تو ایک ایک چٹکی کرکے اچھائی پھولتی پھلتی رہے گی۔ تم منہ نہ چھپاؤ ایک اچھی مثال پیش کرنے کے لئے دنیا کو منہ دکھاتی رہو۔"

وہ بھیگی آنکھوں سے بولی۔ "سیتا! میں نے کل بھی یہاں چھپ کر تمہاری باتیں



سنی تھیں۔ تم بہت اچھی ہو۔"

"آؤ آنند کے پاس چلیں۔"

"تم حوصلہ بڑھا رہی ہو تو میں کسی سے نہیں چھپوں گی۔ چلو۔"

وہ دونوں آنند کے دروازے پر آئیں۔ وہ بستر پر بیٹھا سوچ میں غرق تھا۔ آہٹ سن کر نظریں اٹھائیں تو سیتا کے ساتھ رانی کو دیکھ کر چونک گیا۔ ان میں سے ایک محبوبہ تھی جسے وہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دوسری بیوی تھی جس کے لئے دل میں کوئی جذبہ نہ رہا تھا۔

رانی نے اس کے آگے سر جھکا کر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ وہ اٹھ کر بولا۔ "تم نے بار بار معافی مانگی میں معاف کرتا رہا اتنے برسوں تک ٹھکرائے جانے کے بعد آج سیتا کے سہارے معافی مانگنے آئی ہو۔"

وہ بولی۔ "جب میری اچھائیاں ثابت ہوجائیں گی تو تم کسی سفارش کے بغیر مجھے معاف کردو گے۔ میں آج سیتا سے ملنا چاہتی تھی مگر ملنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی اور ملنا بے حد ضروری تھا۔ پھر یہ سوچ کر یہاں آئی کہ تم سے مل کر سیتا تک یہ بات پہنچا دوں۔" وہ ایک لمحہ رکی' پھر بولی۔ "بات یہ ہے کہ مالتی کی عزت خطرے میں ہے۔"

سیتا نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس نے اور آنند نے مالتی کے متعلق کئی سوالات کئے۔ رانی جواب دیتی رہی اور سارا قصہ سناتی رہی کہ بلراج اور دھاون کس طرح مالتی کی مجبوریوں سے کھیلنا چاہتے ہیں اس دوران سیتا اور رانی بستر کے سرے پر بیٹھ گئی تھیں اور آنند کرسی پر آگیا تھا۔

رانی نے تمام باتیں سنانے کے بعد کہا۔ "مالتی اپنے پتی کے ساتھ پرسوں امریکہ چلی جائے گی سیتا! میں تمہارے پاس یہ پیغام پہنچانا چاہتی تھی کہ تمہیں مالتی سے دور رہنا چاہئے ورنہ تم اس سے ملوگی تو بلراج یہ سوچ سکتا ہے کہ تم مالتی کو مالی امداد دو گی۔ پھر وہ ایک عورت کی مجبوریوں سے کھیل نہیں سکے گا۔ میں دشمنوں کو خوش فہمی میں مبتلا رکھنا چاہتی ہوں۔"

سیتا نے ندامت سے کہا۔ "اتنے عرصہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ میں شرم سے مرتی رہوں گی مگر بلراج کو شرم نہیں آئے گی۔ وہ مالتی کو برباد کرنا چاہتا ہے اور میرے جی میں آرہا ہے کہ سارے گھر کو آگ لگا دوں اور اس بے حس اور سنگدل

کے ساتھ جل مروں۔"

رانی نے سمجھایا۔ "دیکھ سیتا! غصہ میں آکر اپنی طرف سے کوئی قدم نہ اٹھانا۔ جب مالتی اور پروفیسر صاحب یہاں سے چلے جائیں گے تب ہم سوچیں گے کہ دشمنوں کے ساتھ کیا کیا جائے؟"

"ہاں ابھی میں خاموش رہوں گی۔ دو دن کے بعد بلراج سے سمجھ لوں گی ویسے تم نے کمال کر دیا۔ پروفیسر صاحب اور مالتی کو پتہ ہی نہیں چلنے دیا کہ شیطان اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ واقعی وہ میاں بیوی شریفانہ زندگی گزار رہے ہیں انہیں ان معاملات سے بے خبر رکھنا چاہئے۔"

پھر سیتا نے آنند کو دیکھا' اور پوچھا۔ "کیا تم اعتراف نہیں کرو گے کہ تمہاری دھرم پتنی بالکل نارمل ہو گئی ہے۔ کیا یہ پہلے جیسی رانی ہے؟"

آنند نے رانی کی طرف نہیں دیکھا' اپنے سر کو تھام کر کہا۔ "تم نے شراب چھڑا کر ظلم کیا ہے میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ طلب ہو رہی ہے۔"

"سچائی کو تسلیم کرتے وقت ایسے ہی سر میں درد ہوتا ہے فرار حاصل کرنے کے لئے نشے کا سہارا لیا جاتا ہے جاؤ پی لو۔ کون تمہارا ہاتھ پکڑ سکتا ہے؟"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "میں جا رہی ہوں۔"

آنند نے اٹھ کر کہا۔ "تم تو ناراض ہو گئیں۔"

"نہیں۔" وہ بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ تم یہاں تھوڑا سا وقت رانی کے ساتھ گزارو۔ اگر تمہارا دل رانی کی اچھائی کو قبول نہ کرے تو پھر ہم سب سے ناتا توڑ کر پینا شروع کر دینا۔"

رانی نے سیتا کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "نہیں! میں جاؤں گی۔ تم یہاں رہو۔"

"میں کس رشتے سے رہوں؟"

"سنبھالنے کے رشتے سے۔ آنند کو میری نہیں' تمہاری ضرورت ہے۔"

"رانی! جو تمہیں سنبھال نہیں سکتا' اسے دنیا کی کوئی عورت نہیں سنبھالے گی۔"

رانی نے کہا۔ "میں ایک بے اثر دوا ہوں اور تم ایک دعا ہو۔ جو قبول ہو رہی ہو میں نے تم دونوں کی زندگی برباد کی ہے میں ہی تم دونوں کو آباد کروں گی۔"



"میں کسی کی دھرم پتنی ہوں۔ مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔"

"دھرم پتنی کسی انسان کی ہوتی ہے شیطان کی نہیں ہوتی۔ بلراج سے تو شیطان بھی شرماتا ہو گا۔"

"وہ جیسا بھی ہے میرا پتی ہے۔"

"صرف تمہارا ہوتا تو میں چپ رہتی مگر وہ مالتی جیسی کتنی ہی شریف عورتوں کو دلدل میں پہنچاتا رہتا ہے۔ کیا جب وہ امریکہ سے واپس آئے گی تو وہ اس سے اپنی ناکامی کا انتقام نہیں لے گا؟ صرف مالتی کی بات نہیں ہے وہ تمہیں بھی آہستہ آہستہ دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ میں نے تمہیں بلراج کے جہنم میں پہنچایا تھا۔ میں ہی تمہیں اس جہنم سے نکالوں گی۔"

سیتا نے تعجب سے پوچھا۔ "تم مجھے بلراج سے چھڑانا چاہتی ہو؟"

"ہاں! تم شروع سے آنند کی ہو اگر وقت کی منہ زور لہروں نے تمہیں اچھال کر بلراج کے پاس پھینک دیا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم آنند کی نہیں رہیں۔ محبت کو کوئی نہیں مار سکتا۔ تم بھی نہیں مار سکتیں چاہے اوپر سے خود کو کتنا ہی مارتی رہو۔"

سیتا نے چند لمحوں تک ہونٹوں کو بھینچ کر رانی کو غور سے دیکھا۔ پھر کہا۔ "تم ایک طرف مجھ سے محبت اور ہمدردی کر رہی ہو' دوسری طرف میرے سہاگ کی کھلی دشمن ہو گئی ہو۔ میری ایک بات یاد رکھو' اگر کبھی تم نے بلراج کے خلاف قدم اٹھایا تو میں تمہاری دشمن بن جاؤں گی۔"

آنند نے ہنستے ہوئے کہا۔ "رانی تمہیں میری طرف لانا چاہتی ہے اور تم مجھے پھر رانی کے حوالے کرنا چاہتی ہو' یہ سارا جھگڑا میرے لئے ہو رہا ہے تم نے ابھی ٹھیک ہی کہا تھا کہ مجھے کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے رانی کے ساتھ تھوڑا وقت گزارنا چاہئے۔"

سیتا نے خوش ہو کر کہا۔ "یہ بات ہوئی۔ میں باہر جا کر اپنی کار میں بیٹھوں گی تمہیں زیادہ وقت نہیں دوں گی۔ میں نہیں چاہتی رانی تمہارے ساتھ ایسے ماحول میں رہے میں تمہیں رانی کے گھر تک چھوڑ کر آؤں گی۔"

اس نے رانی کو پیار سے دیکھا پھر باہر جا کر دروازے کو خود ہی بند کر دیا۔ وہ دونوں کمرے میں تنہا رہ گئے۔ آنند نے پہلی بار توجہ سے رانی کو دیکھا۔ وہ سفید ساری

میں تھی؟ بال کھلے ہوئے تھے چہرے پر ایک ذرا سا میک اپ نہ تھا۔ سادگی نے اس کے
حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ اس کی مانگ میں سیندور نہ ہوتا تو وہ بھری جوانی میں بیوہ نظر
آتی۔ آنند نے کہا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تمہارا بہروپ ہے' یا سچ مچ تم نے خود کو
بدل ڈالا ہے۔"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "ڈاکٹر صاحب میری سچائی کی گواہی دیں گے' ویسے بھی
جھوٹ وہ بولتے ہیں جو کسی سے کچھ لینا چاہتے ہیں۔ میں تم سے تمہیں بھی لینا نہیں
چاہتی تمہیں دینا چاہتی ہوں۔"

"کیا دو گی؟"

"جب مالتی چلی جائے گی تو میں بلراج اور دھاون سے نمٹ لوں گی۔ سیتا کو
بلراج سے نجات دلا کر تمہارے حوالے کردوں گی۔"

"تمہارے ارادے خطرناک لگتے ہیں مجھے بتاؤ کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"ابھی میں نے سوچا نہیں ہے۔"

"تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔"

"آنند! اب میرے اندر ایک ہی لگن ہے کہ تمہیں جتنے دکھ دیئے ہیں اتنا ہی
زیادہ انعام دوں۔ سیتا ایک ایسا انعام ہے کہ اسے پاکر تم ہمیشہ خوش رہو گے۔"

وہ آگے بڑھ کر اس کے قریب آیا۔ "انسان کو سب سے پہلے اپنے آپ سے نیکی
کرنا چاہئے اور تم نے پہلے اپنے آپ کو نیک بنایا۔ پھر ایک کینسر کے مریض سے نیکی
کی۔ تیسری نیکی یہ کہ مالتی سہاگن بنی رہے گی اور اب تم سیتا کو مجھ سے منسوب کرو
گی' رانی! اب یہ ضروری نہیں رہا کہ کوئی ڈاکٹر تمہارے نیک چال چلن کا سرٹیفکیٹ
پیش کرے تم خود اپنی مثال آپ ہو۔ آج میں پھر تمہیں دل کی گہرائیوں سے قبول کرتا
ہوں۔"

رانی نے چونک کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ سنجیدگی سے مسکرا کر اپنے دل کی
طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "کبھی یہاں تم رہتی تھیں ذرا دھڑکنوں سے لگ کر
دیکھ لو کہ اب بھی یہاں رہتی ہو یا نہیں۔"

وہ ایک دم سے چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔ پھر ایک ننھی سی بچی کی طرح اس
کے بازوؤں کی پناہ میں رونے لگی۔ وہ دونوں چند لمحوں تک ایک دوسرے میں ڈوبے



رہے پھر آنند نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی تمہارے گھر چلوں گا۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "وہ تمہارا گھر ہے۔"

"نہیں' جب میں کمانا شروع کروں گا تب سے وہ ہم دونوں کا گھر ہوگا۔"

"پھر تو آج ہی سے وہ ہمارا گھر ہے پچھلی بار تم نے کاروبار کیا تھا' اس سے حاصل
ہونے والا منافع ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ مالتی کو دینے کے بعد اتنی رقم ہے کہ
تم کل ہی سے نیا کاروبار شروع کر سکتے ہو۔"

"یہ بعد کی باتیں ہیں' ابھی تو باہر نکلو سیتا ہمارا انتظار کر رہی ہے۔"

اس نے چھوٹا سا ٹین کا بکس اٹھایا۔ اس میں اپنے دو جوڑے تہہ کر کے رکھنے
لگا۔ رانی نے میز پر سے سیتا کی تصویر اٹھا کر دیتے ہوئے کہا۔ "یہ تصویر ہمارے گھر میں
رہے گی۔"

آنند نے رانی کو محبت سے دیکھا۔ تصویر لے کر بکس میں رکھی۔ پھر دونوں باہر
آگئے۔ دروازے کو تالا لگا دیا۔ سیتا نے آنند کے ہاتھ میں بکس دیکھ کر کار کا پچھلا
دروازہ کھول دیا۔ رانی نے کہا۔ "میں یہاں بیٹھ جاؤں گی آنند کو آگے بیٹھنا چاہئے۔"

"نہیں! ہر شخص اپنی جگہ اچھا لگتا ہے کیوں آنند ٹھیک ہے نا!"

وہ پچھلی سیٹ پر رانی کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "صرف کار میں نہیں' زندگی
کے ہر مقام پر میں اپنی پتنی کے ساتھ رہنے نکلا ہوں۔"

وہ تینوں وہاں سے روانہ ہوئے۔ راستے میں خوب ہنستے بولتے رہے۔ رانی بہت
خوش تھی مگر اندر سے یہ سوچ کر ٹوٹ رہی تھی کہ آنند اس کے ساتھ نیک نامی کی
زندگی گزار سکے گا۔ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ماضی کی کیچڑ اچھالی جائے گی۔ اس کا
سر ندامت سے جھک جایا کرے گا۔

باتوں کے دوران اچانک سیتا نے پوچھا۔ "تم کیا سوچ رہی ہو؟"

"آں............" وہ چونک کر بولی۔ "میں سوچ رہی تھی کہ لگن سچی ہو تو منزل
مل جاتی ہے' مجھے منزل مل گئی سیتا کو بھی مل جائے گی۔"

اس بات پر خاموشی چھا گئی۔ آنند اور سیتا اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے کہ جہاں
رانی پہنچ گئی ہے اب وہاں سیتا کیسے پہنچے گی؟ کیا رانی سیتا کے لئے اپنی جگہ خالی کر دے
گی؟

سنیتا نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہارے دماغ کے کسی گوشے میں یہ بات ہے کہ آنند ہمیشہ تمہارا ساتھ نہیں دے سکیں گے؟"

رانی نے کہا۔ "ہمیں حقیقت سے انکار نہیں کرنا چاہئے اور حقیقت یہ ہے کہ میں بہت زیادہ بدنام ہو چکی ہوں آنند قدم قدم پر بدنامیوں کو برداشت نہیں کر سکیں گے؟"

آنند نے کہا۔ "تم نے برائیوں کا خاتمہ کیا۔ میں بدنامیوں کا مقابلہ کروں گا۔"

رانی کی آنکھیں خوشی سے بھیگ گئیں' وہ بولی۔ "مجھے تم پر بڑا مان ہے مگر کل جب ہماری سنتان (اولاد) ہو گی تو ان بچوں میں بڑوں جیسا برداشت کا حوصلہ نہیں ہو گا۔"

"ہو گا۔ ہم بچوں کو گھٹی میں یہ بات پلائیں گے کہ جب تک ایک بُرا آدمی برائی سے لڑتا رہے' اسے برا نہ کہو جب تک جنگ جاری رہتی ہے اس کا ساتھ دیتے رہو میں نے غصے اور نفرت کے باعث تمہارا ساتھ نہیں دیا تھا۔ یہ میری غلطی تھی۔ ہمارے بچے ایسی غلطی نہیں کریں گے۔"

سنیتا نے کہا۔ "رانی! تم نے بڑی ذہانت اور قوتِ ارادی سے ایک اچھی مثال پیش کی ہے۔ اگر تم میری اور آنند کی خاطر قربانی دینے کے لئے کوئی جذباتی غلطی کرو گی تو تمہاری ذہانت حماقت میں بدل جائے گی۔ یہ خوب یاد رکھو کہ صرف اچھی مثال پیش کر دینے سے بات نہیں بنتی۔ اپنی دنیا کو بنانے کے لئے اچھی مثال بن کر زندہ رہنا پڑتا ہے۔"

رانی کی رہنمائی پر سنیتا نے اس کے گھر کے سامنے گاڑی روک دی۔ وہ تینوں کار سے اتر کر گھر میں آئے۔ وہ دو کمروں کا ایک چھوٹا سا کرائے کا مکان تھا۔ وہ مکان بھی رانی کی طرح اندر اور باہر سے صاف ستھرا تھا۔ سنیتا انہیں چھوڑ کر جانا چاہتی تھی مگر رانی یہ کہہ کر کچن میں چلی گئی کہ چائے پینے کے بعد جانے کی اجازت دی جائے گی۔

سنیتا نے کہا۔ "راستے میں بڑی گرد اڑتی رہی۔ میں منہ ہاتھ دھونا چاہتی ہوں۔"

رانی نے کچن سے آواز دی۔ "میرا سوٹ کیس کھول کر تولیہ نکال لو۔ باتھ روم میں صابن پانی سب کچھ موجود ہے۔"



چارپائی کے نیچے سوٹ کیس رکھا ہوا تھا۔ سنیتا نے فرش پر اکڑوں بیٹھ کر سوٹ کیس کو نیچے سے اپنی طرف کھینچا' اسے کھولا رانی کے کپڑے بڑے سلیقے سے تہہ کئے ہوئے تھے۔ تولیہ نظر نہیں آیا۔ اس نے اوپر کے کپڑوں کو اٹھا کر دیکھا تو ایک دم سے ٹھٹک گئی۔ وہاں ایک چھوٹا سا پستول رکھا ہوا تھا اسے اٹھانے سے پتہ چلا کہ پوری طرح لوڈ ہے۔ اس کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی وہ چند لمحوں تک گم صم رہی۔ وہیں تولیہ رکھا تھا۔ اس نے تولیہ نکال کر سوٹ کیس کو بند کیا۔ آنند چارپائی کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا اسے خبر نہ ہوئی کہ سنیتا نے کیا دیکھ لیا ہے۔

غسل خانے میں جانے اور واپس آنے' پھر چائے پینے کے دوران سنیتا کے دماغ میں اس پستول سے فائرنگ ہوتی رہی۔ کبھی بلراج گولی کھا کر گرتا رہا کبھی رانی پھانسی کے تختے پر چڑھتی رہی۔ وہ آنند اور رانی سے رخصت ہو کر گاڑی میں آئی' اسے اسٹارٹ کیا مگر ابھی اس کی کوئی منزل نہیں تھی۔ وہ گھر پہنچنے سے پہلے کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتی تھی۔

اس وقت آٹھ بجے تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے تک ڈرائیو کرتے رہنے اور سوچتے رہنے کے بعد اس نے ایک بہت بڑی کیمسٹ کی دکان کے سامنے گاڑی روکی۔ دکان کے کاؤنٹر پر سیلز مین اکیلا تھا۔ اس نے اندر جا کر اس سے کچھ کہا۔ سیلز مین نے چونک کر اسے دیکھ پھر انکار میں سر ہلایا۔ سنیتا نے پرس میں سے سو سو کے کچھ نوٹ نکال کر اسے دیئے۔ وہ کچھ کمزور پڑ گیا پھر بھی اس نے انکار کیا۔ سنیتا نے پرس میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو سو سو کے نوٹوں کی ایک موٹی گڈی تھی۔ سیلز مین نے اسے کانپتے ہاتھوں سے لیا پھر دکان کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک چھوٹا سا پیکٹ تھا۔ سنیتا نے اس پیکٹ کو لے کر پرس میں رکھ لیا۔

جب وہ گھر پہنچی تو بلراج موجود نہیں تھا۔ ملازم نے بتایا کہ صاحب کا فون آیا تھا۔ سنیتا نے ملازم کو جانے کے لئے کہا پھر فریج کو کھول کر دیکھا۔ وہاں شراب کی تین بھری بوتلیں تھیں اس نے پرس میں سے وہ پیکٹ نکالا۔ تینوں بوتلوں کو کھولا پھر اس پیکٹ کے سفوف کو ان تین بوتلوں میں تقسیم کر کے حل کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کر رہی تھی وہ جانتی تھی کہ بلراج سے کہاں رابطہ قائم ہو سکتا ہے لیکن جب رابطہ قائم ہوا تو دھاون کی آواز سنائی

دی۔ "ہیلو جانی! کون ہو؟"

"تمہاری ماں ہوں۔ بلراج کہاں ہے؟"

"اوہ بھابی تم ہو۔ یہ لو بلراج سے باتیں کرو۔"

"ٹھہرو۔ کیا بلراج کے ساتھ ابھی گھر آسکتے ہو؟ تمہیں اس لئے بلا رہی ہوں (
بلراج مجھ سے ناراض ہیں تم ہی ہمارے درمیان صلح کرا سکتے ہو؟"

"یہ نیک کام کرنے ابھی آؤں گا۔"

اس کے بعد بلراج کی آواز سنائی دی۔ "میں نے سات بجے فون کیا تھا تم گھر پر
نہیں تھیں، کیا پھر وہاں گئی تھیں؟"

"میں فون پر جواب نہیں دے سکتی۔ یہاں آجاؤ۔ آج آخری فیصلہ ہوگا۔"

یہ کہتے ہی اس نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ یقیناً تلملایا ہوگا۔ سیتا اتنے عرصے تک اس
کے ساتھ رہ کر اس کی رگ رگ کو سمجھ گئی تھی کہ وہ اس طرح جھنجلا کر بھاگتا ہو
آئے گا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئی۔ دیکھا جائے تو وہ خود اس زندگی
سے جھنجلائی ہوئی تھی۔ جھنجلاہٹ میں ہی انسان خود کو اس قدر نقصان پہنچاتا ہے کہ
اپنی زندگی کو بھی ختم کر دیتا ہے۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے کاغذ کی تین چھوٹی پرچیاں بنائیں ان تینوں پر چھوٹ
میں باری باری لکھا۔ "شراب زہر ہے۔"

ان پرچیوں کو گوند لگا کر اس نے تینوں بوتلوں پر چپکا دیا۔ بلراج نے اسے اتنی
دولت دی تھی کہ وہ کتنے ہی دکھی انسانوں کے کام آسکتی تھی لیکن مالتی اور پروفیسر جیسے
شریف لوگ دکھ جھیل کر مرجاتے ہیں مگر حرام کی دولت مدد کے طور پر قبول نہیں
کرتے۔ آج سیتا کو شدت سے احساس ہوا تھا کہ وہ بے حد غریب ہے، اور ایسی گئ
گزری ہے کہ کسی کے برے وقت کام نہیں آسکتی۔

ویسے اپنی جھولی میں کچھ نہ ہو تب بھی کسی کے کام آنے کا راستہ نکل آتا ہے۔
اب وہ مالتی کے کام آرہی تھی۔ بلراج اور دھاون کو ہمیشہ کے لئے اس کے راستے سے
ہٹا رہی تھی۔ رانی کو بھی پستول استعمال کرنے کا موقع نہیں دے رہی تھی اس بیچاری
نے آنند کے ساتھ صاف ستھری زندگی کا آغاز کیا تھا۔ یہ سیتا کا فیصلہ تھا کہ رانی ایک
عمدہ مثال بن کر دنیا میں رہے۔



"اور میں؟" سیتا نے سرد آہ بھر کر سوچا۔ "اب میں آنند کو پانا نہیں چاہتی
بلراج کی دولت پر جینا نہیں چاہتی۔ قانون کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتی۔ کسی زمانے میں
چتی اپنے ہی پتی کے ساتھ چتا میں جل مرتی تھی، آج اپنے پتی کے ساتھ زہر میں بجھ
جاؤں گی۔"

باہر پورچ میں گاڑی کی آواز سنائی دی۔ وہ ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر
چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ دھاون نے بلراج کے ساتھ اندر آتے ہی کہا۔ "ہیلو بھابی!
یہ دیکھو میں بلراج کو پکڑ لایا ہوں۔"

بلراج نے غصے سے سیتا کو دیکھا پھر فریج کی طرف گیا وہ اس کی بری عادت کو
اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ گھر میں آتے ہی بوتل کی طرف لپکتا تھا اس نے بوتل کو اٹھا کر
حیرانی سے پوچھا۔ "کیا یہ تم نے لکھا ہے؟"

"ہاں میں نے لکھا ہے۔"

دھاون نے پوچھا۔ "کیا بات ہے جانی؟"

بلراج ایک بوتل اور دو گلاس لے کر دھاون کے پاس آیا۔ دھاون نے بوتل
کے لیبل کو پڑھتے ہی قہقہہ لگا کر کہا۔ "واہ بھابی آپ نے کوئی نئی بات نہیں لکھی یہ تو
سب ہی کہتے ہیں کہ شراب زہر ہے۔"

سیتا نے کہا۔ "اگر زہر نہیں ہے تو ایک گلاس مجھے بھی دو۔ زہر ہے تو بوتل توڑ
دو۔"

وہ فریج کے پاس گئی اور ایک گلاس لے آئی۔ بلراج نے کہا۔ "تم تو شکایت کرتی
تھیں کہ میں تمہیں دوستوں کی محفل میں پینے پر مجبور کرتا ہوں، آج خود ہی گلاس لے
آئیں۔"

"ہاں.........." وہ بولی.......... "تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے۔ وہ یہ کہ
آج میں آنند سے آخری بار مل کر آئی ہوں اب کبھی اس کا منہ نہیں دیکھوں گی۔ ابھی
میں تمہاری خوشی کے لئے پی رہی ہوں۔"

بلراج نے تین گلاسوں میں شراب ڈالی، تھوڑا سوڈا ملایا۔ پھر تینوں نے اپنے
اپنے گلاس اٹھائے بلراج نے خوش ہو کر کہا۔ "یہ پہلا پیگ سیتا کے آخری دانشمندانہ
فیصلے کے نام ہے۔ چیئرز۔"

دھاون نے بتیسی نکال کر کہا۔ "چیئرز جانی چیئرز..........."
تینوں گلاس ایک دوسرے سے ٹکرائے پھر تینوں کے لبوں تک پہنچ گئے۔

☆------☆------☆